جلد ۳ جون ۱۹۳۴ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۳	جون ۱۹۷۵ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ	عدد ۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زر سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جب کوئی غلط کار انسان کسی مذموم مقصد کے حصول کی خاطر کسی پاکیزہ چیز کا سہارا لیتا ہے تو اس کے اس فعل کو محاورے کی زبان میں یوں کہا جاتا ہے "شیطان کتاب مقدس کا حوالہ پیش کر رہا ہے" قریب قریب اسی محاورے کے مصداق مذہب کے وہ بگڑے ہوئے شیدائی ہیں جو زر پرستی کے جنون میں سادہ لوح عوام کے نہایت سطحی جذبات سے کھیلنے کے لیے مذہبی سوانگ رچاتے ہیں، مذہبی ڈراموں کا انتظام کرتے ہیں اور کروڑوں اربوں پونڈ خرچ کر کے مذہبی فلمیں تیار کر کے اپنی توانائیاں کھپا رہے ہیں اور جھوٹے پراپیگنڈے کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جو کام وہ سرانجام دے رہے ہیں اس کا مقصد صرف "دینی خدمت" ہی ہے اور یہی مقدس جذبہ ان کی ساری سرگرمیوں کا محرک و محور ہے - ان "خادمانِ مذہب" کی دینی خدمات کی نوعیت اس آبرو باختہ مغنیہ کے جذبہ دینی کی سی ہے جو یہ دیکھ کر کہ عوام کے دلوں میں محراب و منبر کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہی، ان پر خود قبضہ کر کے اور وہاں ناچ گانے کا دلچسپ پروگرام ترتیب دے کر معابد کو عوام کی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کرے -

---

جس طرح پاکیزہ کھانا پاکیزہ برتنوں میں اور پاکیزہ آداب کے ساتھ ہی کھایا جاتا ہے بالکل اسی طرح تبلیغ دین جیسا مقدس کام مقدس عزم، مقدس ہاتھوں اور مقدس انداز ہی سے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ مسلمان بھی گمراہ قوموں کی نقالی میں تبلیغ دین کے لیے ایسے ذرائع اختیار کرنے لگے ہیں جو مسلک شیطان کے پرچار کے لیے تو کارآمد ہو سکتے ہیں مگر اللہ کے دین کی اشاعت کے لیے کسی طرح بھی سود مند ثابت نہیں ہو سکتے۔ ان مختلف ذرائع میں ایک اہم ذریعہ فلم ہے۔ جو لوگ تفریح کے اس ناپاک کاروبار کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ شراب کی طرح یورپ کے تھکے ہارے مزدوروں، جن سے یورپی کارخانوں میں جانوروں

سے بھی زیادہ کام لیا جاتا تھا، کے اعصابی تناؤ کو دور کرنے کے لیے ایک مؤثر آلہ کار کی حیثیت سے شروع ہوئی۔ دولت کے حریص کارخانہ داروں کو مزدوروں کے استحصال کے لیے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ انہیں شراب کا رسیا بنا دیا جائے تاکہ مدہوشی کے عالم میں وہ بیچارے اس بات سے بے خبر رہیں کہ انہیں کس قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے اور حیوانوں کی طرح کام کرتے کرتے جب ان کے اعصاب جواب دینے لگیں تو انہیں سستی تفریح کے ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جن سے اُن کے سفلی جذبات کی کسی حد تک تسکین ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ناپاک دھندا وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے اندر کوئی اخلاقی حس موجود نہ ہو۔ چنانچہ اس مذموم کام کے لیے صرف ان لوگوں نے اپنی دولت صرف کرنے پر آمادگی ظاہر کی جو معاشرے کی اخلاقی اقدار کو تباہ کر کے اور انسان کو پورا حیوان بنا کر اس سے ہر طرح کے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے درپے تھے اور اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے ایسے افراد کی تلاش شروع ہوئی جو عوام کے سفلی جذبات سے کھیل کر اُن کی جیبیں خالی کرانے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ جو صنعت اس قسم کے ناپاک عزائم کے ساتھ شروع ہوئی ہو اور اس نوعیت کے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنے دائرہ کار کو پھیلا رہی ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ اسے پاکیزہ مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے اسی طرح کی ابلہ فریبی ہے جس طرح کہ اسلام کا کوئی نادان دوست یہ سمجھ بیٹھے کہ مساجد کے اندر کلب کا ماحول پیدا کر کے عوام کو اللہ کے دین کا شیدائی بنایا جا سکتا ہے۔ اسے انسانیت کا ایک عظیم المیہ کہہ لیجیے کہ دورِ جدید میں اس نوعیت کی ابلہ فریبیوں کی ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں جن میں نمایاں مثال مذہبی فلموں کے ذریعے دینِ حق کی تبلیغ کا دھندا ہے۔ چند سال پہلے سے یہ خبریں منظرِ عام پر آ رہی تھیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ماننے والے ان کی پاکیزہ زندگی کو فلما کر عوام کے دلوں میں ان کی محبت و عظمت کا نقش ثبت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اب یہ روح فرسا اطلاع ملی ہے کہ بعض سرپھرے مسلمان عیسائیوں کی تقلید میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے بارے میں فلم تیار کرنے میں مصروف ہیں جو غالباً اس سال کے آخر تک نمائش کے لیے تیار ہو جائے گی۔

امریکہ میں مقیم ایک شامی کمیونسٹ مصطفٰے العقاد اس فلم کا ہدایت کار ہے جس نے میکسیکن، اطالوی، ہنگرین، یونانی اور دیگر یورپی اداکاروں اور فنی ماہرین کی ایک بہت بڑی تعداد کو اس فلم کی تیاری پہ لگا رکھا ہے۔ فلم کی کہانی چار مصری ناول نویسوں، توفیق الحکیم، محمد علی ماہر، عبدالحمید جودا اور عبدالرحمٰن شرقوی نے مل کر لکھی ہے۔ پوشاک کی تیاری برطانوی نژاد مس ڈالٹن کے سپرد ہے۔ یہ وہ خاتون ہے جو اس سے قبل

اسی نوعیت کی ایک فلم " لارنس آف عریبیا " کے ملبوسات تیار کرکے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے مس ڈوالٹن کو قبل از اسلام عرب شاعری کے ترجمہ شدہ کچھ نمونے بھی مہیا کیے گئے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں وہ اُس دَور کے لیے موزوں لباس تیار کروا سکے۔ فلم کی عکس بندی کا کام جیک ہل یارڈ کے ذمے ہے جو قدیم مناظر کو پیش کرنے میں بڑا ماہر خیال کیا جاتا ہے ۔ اس فلم میں معروف اداکار رہبری گریگ بھی شامل ہے جس کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ اُسے قرآن پاک کی کئی ایک سورتیں یاد ہیں اور اللہ کے کلام سے محبت کی وجہ سے جامعہ ازہر کے بعض علماء اُسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔

ایک لبنانی نوجوان منیر نے حضورؐ کے چچا زاد بھائی سیدنا جعفر طیارؓ کا کردار ادا کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابوسفیانؓ اور ہند کے کردار ادا کرنے کے لیے بھی بعض لبنانی اداکاروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں ۔ حضرت حمزہؓ کا کردار میکسیکو کے ایک ایکٹر انتھونی کوئن نے ادا کیا ہے ۔

اسلام کے ان " نادان دوستوں " نے شاید مسلمانوں کے ردعمل کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین میں سے کسی کا کوئی کردار شامل نہیں کیا ۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مرحلے پر وہ مسلمانوں کے احساسات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کی روشنی میں مستقبل کے لیے کوئی منصوبہ تیار کر سکیں۔ اگر مسلمانوں نے اس ناپاک جسارت کو ایک مرتبہ گوارا کر لیا اور مسلم عوام الناس نے اس " دینی خدمت " کی پذیرائی کی تو جلد ہی ایسی فلمیں تیار ہونی شروع ہو جائیں گی جن میں حضورؐ سرور کائنات اور ان کے جلیل القدر اصحابؓ کے کردار کی عکاسی بھی ہو گی

موجودہ فلم کی تیاری پر دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے ۔ پہلے مرحلے پر تو مراکش، لیبیا، کویت اور بحرین سب نے مل کر اس منصوبہ کو بڑی فیاضی کے ساتھ مالی امداد فراہم کی لیکن جب مسلمانوں کی طرف سے اس ناپسندیدہ کام پر سخت احتجاج ہوا تو لیبیا کے کرنل قذافی کے سوا باقی سارے فرمانروا اس کی امداد سے دستکش ہو گئے ۔ اب یہ فلم کرنل صاحب کے مالی اور اخلاقی تعاون سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے ۔ جب فلم کی تیاری کا منصوبہ بنایا گیا تو اس وقت عام خیال یہی تھا کہ اس کے لیے مراکش کی سرزمین اور ماحول ہی بہترین ثابت ہو گا اور کام کا آغاز بھی اسی ملک میں ہوا لیکن جب وہاں کے عوام نے اس پر شدید غم و غصّے کا اظہار کیا تو وہاں

سے اس کی بساط لپیٹ دی گئی مگر لیبیا کے حکمران نے اپنے "جذبہ دینی" کے تحت اسے طرابلس کی سرزمین میں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں تاکہ یہ جلد ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے۔ معلوم نہیں کرنل صاحب خواص و عوام کے شدید احتجاج کے باوجود اس فلم میں کیوں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار فرما رہے ہیں لیکن عام روایت یہی ہے کہ اس فلم کے بعض حصے جب انہیں دکھائے گئے تو وہ ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ جو لوگ انسانی نفسیات سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی مصنوعی منظر کو دیکھ کر خواہ وہ کتنا ہی تکلیف دہ ہو آبدیدہ ہو جانا ذہنی ناپختگی اور سطحی جذباتیت کی دلیل ہوتی ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے بڑے طمطراق کے ساتھ جو مذہبی فلمیں تیار کی تھیں اُن کے نتائج دیکھتے ہوئے فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد نے اس مشغلہ کو بیکار سمجھ کر ترک کر دیا ہے اور جن حضرات نے بڑے اخلاص کے ساتھ تبلیغ مذہب کے اس طریقے کو اپنانے کی کوشش کی تھی وہ کثیر مقدار میں مال و دولت اور محنت کے زیاں اور تجربات کی کڑی آزمائشوں سے گزر کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فلم کے ذریعے دین کی قطعاً کوئی خدمت نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے مذہب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ مذہبی فلموں کے بہت سے منصوبے جو بڑی محنت سے تیار کیے گئے تھے دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں لیکن اسے مسلم قوم کی بدقسمتی سمجھیے کہ اس کے بعض افراد اسی نوعیت کے ناکام اور اخلاق سوز تجربات کر کے اللہ کے دین کو رسوا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

فلموں کے بعض احمق شیدائی ابھی تک اس بات پر مصر ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے دین کی سربلندی کے لیے اسلامی فلمیں تیار کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنی چاہییں تاکہ حق کا بول بالا ہو لیکن اس طرح کی بے معنی باتیں کرنے والے غالباً فلم کے مضر اثرات سے یکسر ناآشنا نظر آتے ہیں۔ اسے محض اتفاق سمجھیے کہ جن دنوں یہ اشارات لکھے جا رہے تھے راقم الحروف کو ایسے کئی ایک "دردمندانِ ملّت" کے خیالات سننے کے مواقع حاصل ہوئے جو فلم کی وساطت سے اشاعتِ اسلام کا مقدس فرض سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ان سے گفتگو کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ پیسے کمانے اور شغل کی غرض سے یہ دھندا کرنا چاہتے ہیں ورنہ جہاں تک تبلیغ دین کا تعلق ہے وہ اس باب میں کوئی زیادہ پُر اُمید نہیں۔ یہ سوال چونکہ ہم سے بار بار کیا جاتا ہے کہ ہم مذہبی فلموں کی کیوں مخالفت کرتے ہیں اس لیے ہم یہاں اس کا جواب بڑے اختصار کے ساتھ عرض کرتے ہیں۔

ہماری مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈراما اور فلم دونوں کی بنیاد نقالی پر ہے۔ کچھ لوگ جنھیں نقالی کے فن میں مہارت حاصل ہوتی ہے وہ چند کرداروں کی نقل کرکے اسے تماشائیوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور یہ وہ فن ہے جو انسان کے نہایت ہی سطحی جذبات، جن میں تفریح کا عنصر غالب ہوتا ہے کی تسکین کرتا ہے اس لیے دینی نقطۂ نظر سے یہ مفید ہونے کے بجائے سخت نقصان دہ ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ داڑھی کی مسلم معاشرے میں جو عزت و توقیر ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ جس شخص کا چہرہ داڑھی سے مزین ہو اس کے لیے دل میں جذبۂ احترام پیدا ہو جاتا ہے۔ اب ایک شخص آپ کے سامنے مصنوعی داڑھی لگا کر نمودار ہوتا ہے اور آپ کو اس بات کا علم بھی ہے کہ اس کے چہرے پر داڑھی کی سجاوٹ محض بناوٹ ہے تو کیا آپ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اس باریش شخص کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبۂ احترام پیدا کر سکیں گے؟ احترام تو خیر بڑی بات ہے نقالی کی صورت میں تو اس دینی شعار کی تضحیک ہوگی۔ بالکل یہی ذہنی اور جذباتی کیفیت ان مقدس ہستیوں کے بارے میں پیدا ہوگی جن کے کرداروں کی نقالی عوام کے سامنے پیش کی جائے گی۔ بگڑے ہوئے اور آوارہ مزاج لوگ جب محض اداکاری کے ذریعے اللہ کے برگزیدہ بندوں کی سیرت کے کچھ پہلوؤں کو تماشائیوں کے سامنے لائیں گے تو ظاہر بات ہے کہ یہ تماشائی ان کے فن اداکاری کی داد تو ضرور دیں گے مگر نیکی اور پرہیزگاری کی نقالی سے قطعاً متاثر نہ ہوں گے کیونکہ جب کسی شخص کو معلوم ہو کہ پاکیزگی، خدا ترسی اور تعلق باللہ کے جو مناظر سامنے آ رہے ہیں وہ سب بناوٹ ہے تو اس کے دل میں ان بزرگ ہستیوں کے لیے جذبۂ احترام کس طرح پیدا ہو سکے گا۔ وہ بھانڈ جو ایک نقال کی حیثیت سے کسی درویش کا سوانگ بھر رہا ہو وہ درویش کی تذلیل کا باعث تو بنتا ہے لیکن اس کی عظمت کا نقش کسی دل میں نہیں بٹھا سکتا۔ درویشی ایک خاص نوعیت کی پاکیزہ قلبی کیفیت کا نام ہے جسے وہ بھانڈ نہ تو اپنا سکتا ہے اور نہ اپنانے کا کوئی عزم اور ارادہ رکھتا ہے اس کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ اس درویش کی ظاہری وضع قطع کی بھونڈی نقالی کرکے اسے تماشائیوں کے سامنے اس انداز سے پیش کرے جس سے اُن کی ضیافت طبع کا سامان ہو سکے اور وہ اسے چندے دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

فلم ساز "خادمانِ دین" کے طرز استدلال کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ انھوں نے اتباع اور نقالی کے مابین جو نہایت واضح فرق ہے اسے یکسر نظرانداز کر دیا ہے۔ کسی برگزیدہ ہستی کا اتباع خلوص پر مبنی ہوتا ہے

اور متبع ہر وقت اس بات کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے پورے ڈھانچے کو ہادی کی ہدایت کے مطابق ڈھال لے لیکن ایک مخلص متبع کے برعکس ایک اداکار اپنی پوری زندگی تو اپنے ذوق کے مطابق فسق و فجور میں بسر کرتا ہے۔ اُس کے دل میں نہ تو کسی پاکیزہ زندگی کو اپنانے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ اسے اپنے لیے موزوں سمجھتا ہے لیکن اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے کسی مقدس زندگی کے چند ایک واقعات کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ تماشائی اس کے فنی کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

فلم تبلیغ دین کا اس بنا پر بھی ذریعہ نہیں بن سکتی کہ عوام تفریح کی غرض سے سینما گھروں کا رُخ کرتے ہیں اور تفریح طبع کی خاطر وہ وہاں کچھ وقت گزارتے ہیں۔ اس ذہنی کیفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ سینما ہال کی پوری فضا فسق و فجور سے معمور ہوتی ہے اور انسان سفلی جذبات کی تسکین کے لیے ہی فلم سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس قسم کی اخلاق سوز فضا میں نیکی اور پرہیز گاری کی باتیں بالکل اسی طرح کی طفلانہ باتیں ہیں جس طرح کہ کوئی سر پھرا بادہ خوار میخانے کے اندر نشہ میں غرق ہو کر اذان دینے لگے۔ اس ناپاک ماحول میں جو شخص بھی اس طرح کی حرکت کرے گا کیا وہ رندوں کی محفل میں اضحوکہ نہ بنے گا۔ جس طرح خدا کی محبت ایک پاکیزہ دل کے اندر ہی پیدا ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح خدا خوفی اور خدا ترسی کے پاکیزہ جذبات پاکیزہ ماحول ہی میں پرورش پاتے ہیں۔ جب کوئی انسان پاکباز لوگوں کی پیروی میں خدا کے ساتھ اپنا رشتہ عبودیت استوار کرنے کا عزم کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنی ذہنی کیفیت بدلتا ہے۔ پھر اپنے ماحول میں دینی تقاضوں کے مطابق تبدیلی لاتا ہے کیونکہ ان بنیادی تغیرات کے بغیر وہ صحیح معنوں میں اللہ کا بندہ نہیں بن سکتا۔ ذہنی تبدیلی کا پہلا مظہر یہ ہے کہ انسان غیر سنجیدہ مشاغل چھوڑ کر سنجیدہ کاموں میں منہمک ہو جاتا ہے اور وہ ناپاک ماحول کو تیاگ کر پاکیزہ ماحول کی تلاش شروع کر دیتا ہے جو اللہ سے تعلق خاطر بڑھانے کے لیے زیادہ سازگار ہو۔

دنیا کا کونسا گوشہ ایسا ہے جو فرمانروائے حقیقی کی فرمانروائی سے باہر ہو لیکن اس کے باوجود دنیا کے سارے مذاہب نے احساسات عبودیت کو پروان چڑھانے کے لیے مساجد اور معابد کی تعمیر کا خاص التزام کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدا صرف ان عبادت گاہوں کے اندر ہی مقید ہے اور ان سے باہر اس کا وجود ناپید ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تقدس کا جو ماحول یہ عبادت گاہیں فراہم کرتی ہیں وہ دوسرے

مقامات پر میسر نہیں آتا۔ احادیث میں ماحول کے اس اختلاف اور انسانی طبائع پر اس کے اثرات کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مثلاً حضورؐ نے منڈیوں اور بازاروں کو ناپسندیدہ مقامات قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو اس امر کی تلقین کی ہے کہ وہ مساجد میں اپنا دل لگانے کی کوشش کریں۔ اسی طرح حضور سرورِ دو عالم نے حمام سے بھی نفرت کا اظہار فرمایا ہے۔ مسجد کی تعریف و توصیف اور اس کے مقابلے میں منڈی، بازار اور حمام سے بیزاری کا سبب آخر اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ مسجد کے ماحول میں جو تقدس، پاکیزگی اور روحانیت پائی جاتی ہے اس میں نہ صرف انسان اپنے آپ کو خدا سے قریب تر پاتا ہے بلکہ اس کے دل میں خدا کا قرب حاصل کرنے کی امنگ بھی اُبھرتی ہے۔ مسجد کے برعکس منڈی اور بازار میں چونکہ انسان مال و دولت کے جمع کرنے میں منہمک ہوتا ہے اس لیے وہاں ہر وقت اس بات کا خطرہ لاحق رہتا ہے کہ وہ دنیوی مال و دولت کی محبت میں کھو کر خدا سے غافل نہ ہو جائے۔ یہی حال حمام کا ہے۔ وہاں انسان غیر سنجیدہ ذہن کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شرم و حیا کے اس معیار کو برقرار نہیں رکھ سکتا جو اسلام کا مطلوبہ معیار ہے اور بے تکلفی کی فضا میں بعض ایسی باتیں زبان سے نکال دیتا ہے یا بعض ایسی ناشائستہ حرکات کر بیٹھتا ہے جو ایک خدا ترس انسان کو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتیں۔

دینی نقطہ نظر سے فلم اور ڈرامے کے ان خارجی نقائص کے علاوہ ان کی داخلی ہیئت اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ ان میں مذہب اور مذہبی اقدار کو صحیح انداز میں سمویا نہیں جا سکتا۔ ڈراما زندگی کی عکاسی کا نام نہیں بلکہ زندگی کے بعض واقعات کے اندر غیر معمولی ہیجان پیدا کر کے انہیں عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوشش ناتمام کا نام ہے۔ کسی انسان کی سیرت خواہ وہ کتنی دلکش اور پاک ہو اس وقت تک ڈرامے کے لیے موزوں نہیں بن سکتی جب تک اس کے توازن کو درہم برہم کر کے اس کے اندر تصادم، تضاد، اُلجھاؤ نہ پیدا کر لیا جائے۔ پھر کسی کامیاب ڈرامے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں وحدتِ زمان، وحدتِ مکان، وحدتِ عمل اور وحدتِ تاثر شروع سے آخر تک قائم رہے۔ ڈرامے کے یہ سارے تقاضے ڈراما نگار کو اس بات کے لیے مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک فیصد حقیقت کے ساتھ ننانوے فیصد جھوٹ ملا کر اسے اس ہنرمندی سے پیش کرے کہ انسانی ذہن پر اس آمیزش کا ایک خاص اثر مترتب ہو۔ یہ بات چونکہ ذرا مشکل ہے اس لیے ہم چند مثالوں کے ذریعے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ چند سال پیشتر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں ایک فلم تیار ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ سیدنا (باقی بر صفحہ ۴۶)

فصل پنجم

اخلاقی تعلیمات

(۲)

تاریخ انسانی سے اچھے اور برے کرداروں کی مثالیں اسباب ضلالت کی یہ تفصیلات جو قرآن میں بیان کی گئی تھیں یہ سب قریش اور عرب کے معاشرے میں پائی جاتی تھیں اور ایک ایک شخص جو ان کو سنتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا کہ فی الواقع ہمارے اندر گمراہی کے یہ سارے اسباب کار فرما ہیں۔ اس کے بعد قرآن مجید نے تاریخ انسانی سے پے درپے ایسے کرداروں کی مثالوں کو بھی نمایاں کر کے بیان کیا جو بہترین یا بدترین تھے، تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اسلام کیسے انسان بنانا چاہتا ہے، اور کیسے انسان اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں جن کی یا تو اصلاح ہونی چاہیے، یا پھر ان کے وجود سے معاشرے کو پاک کر دینا چاہیے، یا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے غضب کا نشانہ بنا کر اس دنیا میں تباہ کر دیا۔ قرآن کے اس بیان کو ذرا سلسلہ وار تاریخی ترتیب کے ساتھ دیکھتے جائیے۔

آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا واقعہ سب سے پہلا عبرتناک واقعہ جو تاریخ انسانی میں پیش آیا وہ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ہے جس میں دو کردار ایک دوسرے کے مقابلے میں سامنے آتے ہیں۔ دونوں بھائی قربانی کرتے ہیں۔ ایک کی قربانی مقبول ہوتی ہے، دوسرے کی نہیں ہوتی۔ وہ حسد میں آکر اپنے بھائی سے کہتا ہے کہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس کا بھائی کہتا ہے کہ اللہ تو پرہیزگاروں کی قربانی قبول کیا کرتا ہے (یعنی تیری قربانی قبول نہ ہونے میں میرا کوئی قصور نہیں، تو اپنے اخلاق و اعمال کی اس خامی کو دور کرنے کی فکر کر جس کی وجہ سے تیری قربانی قبول نہیں ہوتی)۔ لیکن اگر تو میرے قتل ہی کے درپے ہوگا تو میں تیرے قتل کے درپے نہیں ہوں گا، کیونکہ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ تجھ سے لڑ کر میں بھی تیرے ساتھ خونِ ناحق کے گناہ میں شریک ہوں میں اس کو ترجیح دوں گا کہ میرے اور اپنے گناہ کو تو خود ہی سمیٹ لے۔ آخر کار اس ظالم بھائی نے اپنے نیک بھائی کو قتل کر دیا اور پھر اس پر بہت پچھتایا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد دیکھیے کہ عرب کے اس ماحول میں، جہاں انسانی جان کی

کوئی حرمت نہ تھی اور ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم تھا، قرآن نے کتنی عظیم بات کہی کہ "جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کوئی ایک جان بچائی اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی" (المائدہ آیات ۲۷ تا ۳۲)۔

حضرت نوحؑ اور اُن کی قوم

تاریخ کی پہلی قوم جس نے زمین میں سرکشی کا طوفان اُٹھایا وہ حضرت نوحؑ کی قوم تھی۔ قرآن میں کئی جگہ اس کا قصہ بیان کر کے ایک طرف اُس قوم اور اُس کے سرداروں کا کردار پیش کیا گیا جس کی وجہ سے آخر کار وہ سب مبتلائے عذاب ہوئے، اور دوسری طرف خود حضرت نوحؑ کے کردار کی درخشاں مثالیں پیش کی گئیں۔ سورۂ عنکبوت میں بتایا گیا کہ انتہائی شدید مخالفت و مزاحمت کے مقابلے میں ساڑھے نو سو برس تک وہ انتہائی صبر کے ساتھ اُس قوم کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے رہے (آیت ۱۴)۔ اُنہوں نے ہر ممکن طریقے سے نہایت دردمندی کے ساتھ لوگوں کو راہ راست دکھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، مگر قوم کے سرداروں نے اُن کی ایک نہ چلنے دی (سورۂ نوح مکمل)۔ اُن کو مجنون کہا گیا اور سخت ڈانٹ پھٹکار کی گئی (القمر-۹)۔ ان کی اور ان پر ایمان لانے والے غریب لوگوں کی تذلیل کی گئی (ہود-۲۷-الشعراء-۱۱۱)۔ اُن کو دھمکی دی گئی کہ تم اگر باز نہ آؤ گے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا (الشعراء ۱۱۶)۔ مگر انہوں نے ڈٹ کر کہا کہ اگر میرا وجود اور میری نصیحتیں تمہارے لیے ناقابل برداشت ہیں تو جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ میرے خلاف کر ڈالو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا بھروسا اللہ پر ہے (یونس-۷۱)۔

پھر جب کشمکش انتہا کو پہنچ گئی تو اُن کی قوم نے کہا کہ جس طوفان کا تم ڈراوا ہمیں دیتے ہو وہ لے آؤ۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے اُن کی آنکھوں کے سامنے وہ کشتی بنانی شروع کی جس میں بیٹھ کر وہ اور اُن کے ساتھ اہل ایمان اُس آنے والے طوفان سے بچنے والے تھے، مگر اُن کی قوم کے لوگ اُنہیں کشتی بناتے دیکھ کر اُن کا مذاق اُڑاتے پھرتے تھے کہ بڑے میاں کی دیوانگی آخر یہاں تک پہنچ گئی کہ خشکی پر جہاز چلانے کی تیاری کر رہے ہیں، اور انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ عنقریب یہی خشکی ایسا سمندر بننے والی ہے جہاں ایک ایک موج پہاڑوں کے برابر ہو گی جس میں خود حضرت نوحؑ کے بیٹے سمیت سب غرق ہو جائیں گے، اور یہی سطح زمین پر رکھی ہوئی کشتی جودی پہاڑ پر جا ٹکے گی (ہود ۴۲ تا ۴۴)۔

آخری منظر اس قصے کا یہ پیش کیا گیا کہ حضرت نوحؑ نے جب اپنے بیٹے کو بھی دوسرے کافروں کے ساتھ ڈوبتے دیکھا تو بشریت سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اُس کو بچا لیا جائے، مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کو ڈانٹ دیا کہ جاہل نہ بنو، یہ تمہارا بیٹا ہی سہی، لیکن تمہارا "اہل" نہیں ہے بلکہ عمل غیر صالح ہے، اس لیے ایسی درخواست مجھ سے نہ کرو۔ اس پر حضرت نوحؑ نے فوراً معافی مانگی اور عرض کیا کہ "اے میرے پروردگار، میں تیری پناہ مانگتا ہوں

اِس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں، اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا" (ہود - ۴۵ تا ۴۷)۔

قوم عاد اور حضرت ہود علیہ السلام | عرب کی مشہور قوم، عاد، جس سے اہلِ عرب کا بچہ بچہ اُس زمانے میں واقف تھا، اور جس کے متعلق لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ خدا کے عذاب سے تباہ ہوئی تھی، اُس کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ شرک و بُت پرستی کے ساتھ اُس کے اندر کیا اخلاقی عیوب پائے جاتے تھے۔ سورۂ حٰم السجدہ میں ہے کہ "اُنھوں نے زمین میں حق کے بغیر تکبر کیا اور کہا کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟" (آیت - ۱۵)۔ سورۂ فجر میں ہے کہ اُنھوں نے "دُنیا میں بڑی سرکشی دکھائی اور بہت فساد برپا کیا" (آیات ۶ تا ۱۲)۔ سورۂ شُعراء میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے ان سے فرمایا "یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ ہر اُونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو، جبّار بن کر ڈالتے ہو" (آیات ۱۲۸ تا ۱۳۰)۔ سورۂ ہود میں ہے کہ "اُنھوں نے ہر جبّار دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی" (آیت ۵۹)۔ حضرت ہودؑ نے ان کو سمجھانے کی جتنی کوششیں کیں اُن سب کا جواب وہ تمرّد اور عناد اور مخالفانہ چالوں ہی کے ساتھ دیتے چلے گئے، حتّٰی کہ حضرت نوحؑ کی طرح انہیں بھی اپنی قوم سے کہنا پڑا کہ "تم سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو، میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اُس کے ہاتھ میں نہ ہو"۔ (ہود - ۵۵ - ۵۶)۔ آخر کار اُنھوں نے خدا کے پیغمبر سے کہہ دیا کہ "اگر تو سچّا ہے تو لے آ وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے"۔ پھر جب وہ عذاب سامنے سے آتا نظر آیا تو وہ بیوقوف یہ سمجھے کہ یہ بادل ہے جو ہماری وادیوں کو سیراب کرے گا، مگر وہ ایک تباہ کن آندھی تھی جس نے ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا (الاحقاف - ۲۲ تا ۲۵)۔

ثمود اور حضرت صالح علیہ السلام | عاد کے بعد ثمود عرب کی اقوام قدیمہ میں سے مشہور ترین قوم تھی جس کے چھوڑے ہوئے آثار پورے شمالی حجاز میں پھیلے ہوئے تھے اور اب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ قریش کے تجارتی قافلے اُن پر سے گزرتے ہوئے شام کی طرف جاتے تھے۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ ایک خوفناک زلزلے نے اس قوم کو تباہ کیا جس کے اثر سے اُس علاقے کے پہاڑ آج تک کھیل کھیل ہو رہے ہیں۔ قرآن میں بتایا گیا کہ اس قوم نے خدا سے بغاوت کر کے صرف شرک و بُت پرستی کا جرم ہی نہیں کیا تھا بلکہ خدا کی زمین میں سرکشی اور فساد کا طوفان بھی برپا کیا تھا (الفجر - آیات ۶ تا ۱۲ - الاعراف ۴)۔ اُس کے سردار حد سے گزرے ہوئے مفسد لوگ تھے جن کے ہاتھوں کوئی اصلاح کا کام نہ ہوتا تھا (الشعراء - ۱۵۱ - ۱۵۲)۔ وہ اپنے عیش اور اپنی نشان دکھانے کے لیے میدانی علاقوں میں قصر اور پہاڑوں کو تراش تراش کر عمارتیں بناتے تھے

(الاعراف ۴، الشعراء ۱۴۹)۔ یہ ایک بڑھے ہوئے معاشرے کی خصوصیت ہوتی ہے کہ ایک طرف غریب لوگ سر چھپانے کو ڈھنگ کی جگہ تک نہیں پاتے اور دوسری طرف بڑے لوگ شاندار محل تعمیر کرتے ہیں۔ اُن بڑے لوگوں کے نزدیک حضرت صالحؑ اس لیے ایمان لانے کے قابل نہ تھے کہ اُن پر غریب لوگ ایمان لائے تھے (الاعراف ۷۵-۷۶)۔ حضرت صالح نے جب ان کو خدا پرستی کی دعوت دی اور ظلم و فساد اور عیش پرستی سے روکا تو اُن کے ۹ بڑے بڑے مُفسد قبائلی جتھہ داروں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا "خدا کی قسم کھا کر فیصلہ کر لو کہ رات کو صالح اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے، پھر صالح کے ولی (یعنی اُن کے قبیلے کے سردار) سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں" (النمل ۴۸-۴۹)۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس چال کو ناکام کر دیا۔ اُنھوں نے حضرت صالح سے معجزے کا مطالبہ کیا اور ان کے اپنے مطالبے ہی پر اللہ تعالیٰ نے ایک اونٹنی ان کے سامنے لاکر رکھ دی جس کا وجود خود ایک صریح معجزہ تھا۔ اس کے بعد حضرت صالح کے ذریعے سے ان کو خبردار کر دیا گیا کہ یہ اونٹنی تمھاری زمینوں میں جہاں چاہے گی چرتی پھرے گی اور ایک دن تنہا یہ پانی پیے گی اور دوسرا دن تم سب اور تمھارے جانوروں کے لیے ہے۔ اس کو تم نے بُری نیت سے ہاتھ لگایا تو پھر تمھارے اُوپر عذاب آجائے گا (الاعراف ۷۳، ہود ۶۴، الشعراء ۱۵۵)۔ کچھ مدت تک وہ لوگ اس اونٹنی سے ڈرتے رہے۔ آخر کار انھوں نے یہ جانتے ہوئے کہ یہ اونٹنی ایک معجزہ ہے، اپنے ایک سب سے زیادہ سرپھرے سردار کو پکارا کہ اس بلا سے ہمارا پیچھا چھڑا، اور اس نے اس کام کا بیڑا اُٹھا کر اسے مار ڈالا (القمر ۲۹، الشمس ۱۲-۱۴)۔ یہ سرکشی دکھا کر انھوں نے حضرت صالح کو چیلنج دیا کہ لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے (الاعراف ۷۷)۔ حضرت صالح نے کہا بس اب تین دن اپنے گھروں میں مزے کر لو۔ اس کے بعد وہ زبردست کڑاکے دار زلزلہ آیا جس نے حضرت صالح اور اہل ایمان کے سوا پوری قوم کو ہلاک کر دیا اور اُن کے گھر اس طرح پڑے رہ گئے کہ گویا وہاں کبھی کوئی بسا ہی نہ تھا (الاعراف ۷۸، ہود ۶۵ تا ۶۸، القمر ۳۱)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

سب سے بڑا مثالی کردار قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کا پیش کیا گیا جنھیں اہل عرب اپنے دین کا پیشوا مانتے تھے، اور جن کے ساتھ نسبت ہی پر قریش کے سارے فخر و ناز اور رسوخ و اثر کی بنا قائم تھی۔ قرآن نے اُن کو بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام کی وہ کیا خوبیاں تھیں جن کی بنا پر اللہ رب العالمین نے اپنے اس بندے کو اپنا خلیل (دوست) قرار دیا (النساء ۱۲۴) اور فرمایا کہ میں تمھیں تمام انسانوں کا امام بنانا ہوں (البقرہ ۱۲۴)۔ اُن پر جب یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اللہ کے سوا کوئی رب اور الٰہ نہیں ہے اور اُن کا باپ اور ان کی قوم، سب گمراہ ہیں تو اُنھوں نے باپ دادا کی اندھی تقلید کو چھوڑنے، اپنے قومی مذہب کو ترک کرنے، اور

بالکل یکسو ہو کر صرف خالقِ ارض و سما کی بندگی اختیار کر لینے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہیں کی، اور صرف اپنی جگہ خالص خدا پرست بن کر رہ نہیں گئے، بلکہ علی الاعلان اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہہ دیا کہ میں تمہارے اس دینِ شرک سے بیزار ہوں اور میرے نزدیک تم صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو (الانعام ۷۴ تا ۸۱)۔ انہوں نے باپ سے صاف صاف کہا کہ تو اندھے بہرے بے اختیار معبودوں کی بندگی کر کے دراصل شیطان کی بندگی کر رہا ہے، اور باپ نے انہیں سختی کے ساتھ جھڑک کر گھر سے نکال دیا (مریم ۴۳ تا ۴۶)۔ انہوں نے جب قوم کو دلیلوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور وہ نہ مانی تو موقع پا کر اُس کے بُت خانے میں گھس گئے، اور اس کے بتوں کو توڑ کر عملاً اسے یہ دکھا دیا کہ جن کی وہ بندگی کر رہی ہے وہ اُس کو تو کیا، خود اپنے آپ کو بھی بچانے پر قادر نہیں ہیں (الانبیاء ۵۲ تا ۶۷، الصافات ۸۵ تا ۹۶)۔ اُن کو ملک کے بادشاہ، نمرود کے سامنے پیش کیا گیا جو رب ہونے کا مدعی تھا۔ انہوں نے بالکل بے خوف ہو کر کہا کہ میں اُس ہستی کے سوا کسی کو رب نہیں مانتا جس کے ہاتھ میں زندگی و موت ہے۔ نمرود نے کہا زندگی و موت میرے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے بر منہ توڑ جواب دے کر اسے مبہوت کر دیا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اُسے مغرب سے نکال کر دکھا دے (البقرہ ۲۵۸)۔ اُن کے لیے آگ کا الاؤ تیار کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ انہیں اس میں پھینک کر زندہ جلا دیا جائے۔ مگر وہ پھر بھی باطل کے آگے نہ جھکے اور حق کی خاطر جل مرنے پر تیار ہو گئے۔ یہ اللہ کا فضل تھا کہ اس نے آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور اسے ان کے لیے بے ضرر بنا دیا۔ مگر انہوں نے اپنی طرف سے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی کہ وہ آگ میں پھینکا جانا قبول کر سکتے ہیں مگر حق کو چھوڑ کر باطل کی بندگی کرنا قبول نہیں کر سکتے (الانبیاء ۶۸ تا ۷۰، الصافات ۹۷-۹۸)۔ آخر کار جب اُن کے لیے اپنے دین اور اپنے وطن دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تو انہوں نے دین کو نہ چھوڑا اور گھر، خاندان، قوم اور وطن سب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر خدا کے بھروسے پر نکل کھڑے ہوئے، اور یہ جانتے ہوئے کہ غریب الوطنی کیا چیز ہوتی ہے بے تکلف کہہ دیا کہ اِنِّیْ ذَاہِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ، "میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا" (الصافات ۹۹)۔ بڑھاپے کی عمر میں جب بڑی دعاؤں اور تمناؤں کے بعد اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو اُن کے رب نے اُن کو ایک اور سخت آزمائش میں ڈالا۔ اُنہیں اشارہ کیا گیا کہ اِس دودھ پیتے بچے کو اِس کی ماں کے سمیت لے جا کر مکہ کی سنسان، بے آب و گیاہ وادی میں اُس جگہ چھوڑ آؤ جہاں ہم اپنا گھر بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اِس حکم کی تعمیل کے لیے بھی بلا تامل آمادہ ہو گئے اور فلسطین سے جہاں وہ رہتے تھے، سینکڑوں میل دور سے جا کر بیوی اور بچے کو بالکل خدا کے بھروسے پر چھوڑ دیا (الحج ۲۶، ابراہیم ۳۷)۔

پھر ایک اور اس سے بھی زیادہ شدید آزمائش کی گئی۔ جب وہی لڑکا بڑا ہو کر اس عمر کو پہنچ گیا کہ باپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے تو اشارہ کیا گیا کہ اسے ہمارے لیے ذبح کر دو۔ وہ اِس فرمان پر بھی عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قربانی قبول فرما کر ایک "ذبح عظیم" کو اس کے فدیے میں دے دیا۔ (الصافات ۱۰۰ تا ۱۰۷)۔ خدا اور اس کے دین کے معاملے میں وہ کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وطن چھوڑتے ہوئے انہوں نے صاف صاف اپنی قوم سے کہا کہ "ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ" (الممتحنہ-۴)۔ اپنے باپ سے انہوں نے دعائے مغفرت کا وعدہ کیا تھا اور دعا کی بھی، مگر جب انہیں احساس ہوا کہ وہ تو اللہ کا دشمن تھا تو انہوں نے اُس سے محبت کا یہ تعلق بھی ختم کر دیا (التوبہ-۱۱۴)۔ یہ تھی وہ سیرت اور یہ تھا وہ کردار جسے دعوتِ اسلامی نے نمونے کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

حضرت لوطؑ اور قومِ لوط

حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور اُن کے ساتھ ہی ہجرت کر کے فلسطین کی طرف آئے تھے۔ یہاں جس جگہ انہوں نے اپنا مسکن بنایا تھا اُس کے قریب ہی ایک نہایت خبیث قوم آباد تھی جو دنیا میں خباثت کے اعتبار سے اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کو اُس کی اصلاح کا کٹھن کام سپرد کیا اور انہیں نبی بنا کر اُس کے علاقے میں بھیج دیا۔ اُس قوم کا حال یہ تھا کہ اُس میں مرد کی مرد سے مباشرت عام تھی جس کا ارتکاب چھپ کر بھی نہیں بلکہ علانیہ ایک دوسرے کے سامنے اور بھری مجلسوں میں کیا جاتا تھا۔ اس پر مزید وہ ایک رہزن قوم تھی، کسی شخص یا قافلے کا اس کے علاقے سے بخیریت گذر جانا ممکن نہ تھا (النمل ۵۴-العنکبوت ۲۹)۔ حضرت لوطؑ نے برسوں اس کو خدا سے ڈرایا اور اِن حرکتوں سے باز آ جانے کی تلقین کی، مگر اُس کا جواب یہ تھا کہ "اے لوط، اگر تو نے یہ باتیں نہ چھوڑیں تو ہم تجھے اپنے ہاں سے نکال دیں گے" (الشعراء-۱۶۷)۔ حضرت لوط نے اِن دھمکیوں کی پروا نہ کی اور اپنی تبلیغ جاری رکھی تو اِن لوگوں نے آپس میں طے کیا کہ "آلِ لوط کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں" (الاعراف ۸۲-العنکبوت ۵۶)۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اُن کو سزا دینے کا فیصلہ فرما دیا اور اُس پر عملدرآمد کے لیے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا۔ چند فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے ہاں مہمان بنا کر بھیج دیے گئے۔ اُن کا آنا تھا کہ سارے شہر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور لوگ جوق در جوق حضرت لوطؑ کے گھر کی طرف چڑھ دوڑے تاکہ ان لڑکوں کے ساتھ فعلِ بد کریں۔ حضرت لوطؑ نے ان کی بے انتہا منّت سماجت کی کہ میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟ مگر اُن لوگوں پر ایک نشہ سا سوار تھا، انہوں نے حضرت لوطؑ کی

ایک نہ سُنی بلکہ اُلٹا اُن کو ڈانٹا کہ "کیا ہم بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکیدار نہ بنو" (الحجر، ۷۰)۔ تب فرشتوں نے حضرت لوطؑ سے کہا کہ "ہم خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں اور اِن پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں، آپ صبح سے پہلے پہلے اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جائیں"۔ جو لوگ اُن کے مکان پر چڑھ آئے تھے اُن کو تو اُسی وقت اندھا کر دیا گیا (القمر، ۳۷) اور صبح سویرے باقی ساری قوم کا تختہ اُلٹ دیا گیا، اُس کی بستیاں تلپٹ کر دی گئیں اور اُس پر ایسے پتھروں کی بارش کی گئی جن میں سے ہر ایک نشان زدہ تھا کہ کس کو اُن میں سے کس آدمی کا خاتمہ کرنا ہے (ہود ۸۲-۸۳)۔ یہ ایسی بدبخت قوم تھی کہ اُس کے پورے علاقے میں ایک حضرت لوطؑ کے گھر کے سوا کسی باایمان کا گھر نہ پایا جاتا تھا (الذاریات ۳۶) اور اُس ایک گھر میں بھی خود حضرت لوطؑ کی بیوی بے ایمان تھی جس کے متعلق اُن کو حکم دیا گیا کہ اسے ساتھ نہ لے جائیں، کیونکہ اُسے بھی مبتلائے عذاب ہونا ہے (ہود۔ ۸۱)۔ قرآن میں یہ قصہ جگہ جگہ بیان کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ ایک بدکردار قوم کیسی ہوتی ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے، اور اللہ تعالٰی کے پیغمبروں نے کیسے کیسے سخت حالات میں کام کیا ہے۔

قصۂ یوسف علیہ السلام اِس کے بعد تاریخی اعتبار سے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کی باری آتی ہے جس پر ایک پوری سورۃ قرآن میں نازل کر کے اچھے اور بُرے کردار ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کر دیے گئے۔ اس میں ایک طرف برادرانِ یوسف کا کردار ہے، جنھوں نے صرف اِس لیے کہ والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے کم سن بیٹے یوسفؑ سے زیادہ محبت کرتے ہیں آپس میں طے کیا کہ اُن کو قتل کر دیں یا کہیں پھینک دیں اور "اِس کے بعد صالح لوگ بن جائیں"۔ باپ کو دھوکا دیکر بھائی کو سیر و تفریح کے بہانے لے گئے، اُس کو اندھے کنویں میں ڈال دیا، پھر جھوٹ موٹ کا خون اُس کے قمیص پر لگا کر لے آئے اور باپ سے کہا کہ اُسے تو بھیڑیے نے پھاڑ کھایا۔ اُس تجارتی قافلے والوں کا کردار ہے جنھوں نے حضرت یوسف کو اندھے کنویں میں پایا تھا۔ اُنھوں نے اُس مظلوم بچے کو اپنے لیے مالِ تجارت بنا لیا اور مصر لے جا کر بیچ ڈالا۔ عزیزِ مصر کی بیوی کا کردار ہے جس کے شوہر نے حضرت یوسف کو خریدا تھا اور جس کے گھر میں پل کر وہ جوان ہوئے تھے۔ اُس کی بے شرمی کا حال یہ تھا کہ اس نے اُن کو گناہ کی دعوت دی، وہ انکار کر کے بھاگے تو اُن کا پیچھا کیا، جب عین اُس موقع پر اُس کا شوہر آگیا تو اُلٹا اُن پر الزام لگایا کہ وہ اُس کی عصمت خراب کرنا چاہتے تھے۔ اُس کا جھوٹ جب صریح طور پر ثابت ہو گیا اور شہر کے اونچے طبقوں کی عورتوں میں اُس کے عشق کا چرچا ہونے لگا تو اُس نے انہیں اپنے ہاں دعوت پر بلا کر حضرت یوسف کو اُن کے سامنے یہ بتانے کے لیے پیش کیا کہ ایسے حسین جوان پر میں مرنہ مٹتی تو اور کیا کرتی، اور بے تکلف بھری مجلس میں کہا کہ اگر یہ میرے ساتھ ناجائز تعلق پر راضی نہ ہوا تو میں

اسے قید کرا دوں گی۔ مصر کے اونچے طبقے کی عورتوں کا کردار ہے جنہوں نے اس محفل میں حضرت یوسف کا حسن دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے پڑ گئیں اور انہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ مصر کے حاکموں کا کردار ہے جنہوں نے اپنی عورتوں کے اخلاقی بگاڑ کی سزا الٹی حضرت یوسف کو دی اور بے قصور انہیں قید کر کے برسوں جیل میں ڈالے رکھا۔ اس کے مقابلے میں دوسری طرف حضرت یوسف کا کردار ہے جس میں اخلاق کی پاکیزگی کا ایک سے ایک بہتر نمونہ سامنے آتا ہے۔ انہوں نے قید ہو جانا گوارا کر لیا مگر اپنے دامن کو گناہ سے داغدار کرنا گوارا نہ کیا۔ اس پر بھی انہیں اپنے تقویٰ کا کوئی زعم لاحق نہ ہوا بلکہ انہوں نے بڑی عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ "اے میرے پروردگار، قید مجھے اس چیز سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ لوگ مجھے دعوت دے رہے ہیں، اور اگر تو نے ان عورتوں کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف جھک پڑوں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا"۔ انہوں نے جیل میں بھی خدا کے بندوں کو وعظ و نصیحت کر کے راہ راست دکھانے کی کوشش کی اور تبلیغ حق کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس کا صرف ایک واقعہ سورۂ یوسف میں آیت ۳۶ سے ۴۰ تک بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قید کے اس طویل زمانے میں وہ کس طرح دعوت الی اللہ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ پھر جب بادشاہ مصر کے ایک خواب کی تعبیر انہوں نے دی اور بادشاہ نے اس سے متاثر ہو کر انہیں رہا کرنا اور اپنے پاس بلانا چاہا تو انہوں نے اس وقت تک رہائی قبول نہ کی جب تک عزیز مصر کی بیوی اور اس کے ساتھ کی دوسری عورتوں نے ان کی پاک دامنی اور خود اپنے قصور وار ہونے کی شہادت نہ دے دی۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب مصر میں انہیں شاہانہ اقتدار حاصل ہو گیا۔ اس زمانے میں ان کے وہی بھائی جنہوں نے ان کو اندھے کنویں میں پھینکا تھا ان کے پاس بار بار غلہ مانگنے کے لیے آتے رہے اور وہ انہیں غلہ دیتے رہے اور ایک مرتبہ بھی ان کے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ ان سے اس ظلم کا بدلہ لیں جو انہوں نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ اوّل اوّل تو یہ بھائی اس بات سے ناواقف تھے کہ مصر کے جس فرمانروا سے وہ غلہ حاصل کر رہے ہیں وہ کون ہے اور صرف حضرت یوسفؑ ہی ان کو پہچان رہے تھے۔ مگر جب تیسری مرتبہ وہ آئے اور حضرت یوسفؑ نے انہیں بتایا کہ میں تمہارا وہی بھائی ہوں جس کے ساتھ تم نے وہ ظلم کیا تھا جو تم جانتے ہو، اور انہوں نے اپنے خطاکار ہونے کا اعتراف کیا، تو حضرت یوسف کا جواب یہ تھا کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ۔

"آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ پھر صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام کو وطن سے مصر بلوایا، بلکہ ان بھائیوں کو بھی ان کے سارے

اہل و عیال سمیت بلا کر وہاں عزت کے ساتھ آباد کیا۔ آخری شان اِس عظیم انسان کے کردار کی سورۃ یوسف میں یہ دکھائی گئی کہ اپنے اِس عروج پر وہ کسی فخر و غرور کا اظہار نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے آگے سر بندگی خم کر کے عرض کرتا ہے کہ "اے میرے رب، تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ مسلم (فرمانبردار) کی حیثیت سے کر اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔"

حضرت شعیب علیہ السلام اور اہل مَدْیَن و اصحابُ الاَیکہ

قرآن مجید میں اہل مدین اور اصحاب الایکہ کا حال بھی لوگوں سے بیان کیا گیا جن کا علاقہ شمالی حجاز میں واقع تھا۔ ان کے متعلق بتایا گیا کہ خدا کے سوا دوسروں کی عبادت کے ساتھ جو اخلاقی خرابیاں اُن کے اندر خصوصیت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں وہ یہ تھیں کہ وہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے، رہزن لوگ تھے اور انہوں نے بڑا فساد برپا کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو مدین میں اپنا نبی بنا کر مبعوث کیا اور ایکہ والوں کی اصلاح کا کام بھی ان کے سپرد فرمایا۔ وہ مدتوں ان لوگوں کو خدا کا خوف دلا کر ان برائیوں سے باز آنے کی تلقین کرتے رہے مگر صرف ایک قلیل تعداد ان پر ایمان لائی اور باقی سب اپنے کرتوتوں پر اڑے رہے۔ مدین کے سرداروں نے حضرت شعیبؑ سے کہا "کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں، یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں جو کچھ کرنا چاہیں وہ نہ کریں؟" (ہود ۸۷)۔ بالفاظِ دیگر اُنہیں اِس بات پر بھی اصرار تھا کہ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی بندگی صرف اِس وجہ سے کی جائے کہ باپ دادا اُن کی بندگی کرتے رہے ہیں، اور وہ اِس بات پر بھی مُصر تھے کہ اپنے مالوں میں اُنہیں اپنی مرضی کے مطابق ہر طرح کے تصرف کی آزادی ہونی چاہیے خواہ وہ لوٹ مار ہو، یا تجارت میں بے ایمانی ہو، یا کمزور لوگوں پر ظلم و ستم ہو۔ اُنہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ "اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو برباد ہو جاؤ گے" (الاعراف ۹۰)۔ گویا اُن کے نزدیک قوم کا پھلنا پھولنا اسی پر منحصر تھا کہ وہ ہر طرح کے ناجائز طریقوں سے مال و دولت حاصل کرے، اور صرف جائز طریقوں کی پابندی قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ قوم برباد ہو جائے۔ اُنہوں نے حضرت شعیب کو دھمکیاں دیں کہ "ہم تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو نکال باہر کریں گے" (الاعراف ۸۸)۔ اور اُن سے کہا کہ "تم کو تو ہم اپنے درمیان ایک کمزور آدمی دیکھتے ہیں۔ اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہارا اپنا بل بوتا اتنا نہیں ہے کہ ہم پر تم بھاری ہو" (ہود ۹۱)۔ اِس پر حضرت شعیبؑ نے یہ فرما کر انہیں شرم دلائی کہ "میرا قبیلہ کیا تمہارے مقابلے میں اللہ سے زیادہ طاقت ور ہے؟ اُس کو تم نے بالکل پس پشت ڈال دیا؟" (ہود ۹۲)۔ ایسا ہی رویہ اصحاب الایکہ نے بھی حضرت شعیبؑ کے ساتھ اختیار کیا۔ اُن کی کسی نصیحت کو اُنہوں نے قبول نہ کیا اور جواب دیا تو یہ کہ "اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو" (الشعراء ۱۸۷)۔ آخر کار دونوں قومیں خدا کے عذاب میں

گرفتار ہوئیں اور تباہ کرکے رکھ دی گئیں۔ قریش کے لوگ اپنے تجارتی سفروں میں شام جاتے ہوئے ہمیشہ اُن علاقوں سے گزرتے تھے جہاں یہ قومیں مبتلائے عذاب ہوئی تھیں، اِس لیے وہ قرآن کے اِس بیان سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

قصۂ فرعون و موسیٰ علیہ السلام دنیا بھر میں یہ ہولناک تاریخی واقعہ مشہور تھا کہ فرعون اور اس کا لشکر خدا کے عذاب میں گرفتار ہو کر سمندر میں غرق ہوا تھا، اور عرب میں یہود و نصاریٰ کثرت سے موجود تھے جن کے ذریعے سے سارے ہی اہلِ عرب جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس کے پاس نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، اور انھوں نے حیرت انگیز معجزے دکھا کر اُسے دعوتِ حق دی تھی، مگر وہ کسی معجزے کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لایا تھا۔ خود قریش کے لوگ حضرت موسیٰ کے اِن معجزوں سے واقف تھے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُن کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی ، اِن کو وہ معجزے کیوں نہ دیے گئے جو موسیٰؑ کو دیے گئے تھے؟ (القصص - ۴۸)۔ اِسی بنا پر قرآن میں جگہ جگہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا جس سے اچھے اور بُرے کردار اپنی خصوصیات کے ساتھ پوری طرح واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آگئے۔

فرعون کے جرائم اُس میں ایک ایک کرکے گنائے گئے ہیں "اُس نے زمین میں بڑی سرکشی کی، اُس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اُن میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اُس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اُس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مُفسد لوگوں میں سے تھا" (القصص - ۴)۔ یعنی اس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں اور سب کو برابر کے حقوق دیے جائیں، بلکہ اس نے سیاست کا یہ طرز اختیار کیا تھا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے، کسی کو مراعات و امتیازات دے کر حکمران گروہ ٹھیرایا جائے، اور کسی کو محکوم بنا کر دبایا اور پیسا جائے۔ اِس دوسرے گروہ میں خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل پر اُس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ اُن کے لڑکوں کو وہ قتل کرتا اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دیتا تھا، تاکہ رفتہ رفتہ ان کی نسل ختم ہو جائے اور اُن کی عورتیں مصریوں کے تصرف میں آکر ایک مصری نسل پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ اِسی بنا پر جب حضرت موسیٰ ایک اسرائیلی گھر میں پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی والدہ کو اشارہ کیا کہ جب اِس بچے کے قتل کا خطرہ لاحق ہو تو اِسے ایک ٹوکری میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا (القصص - ۷)۔

خود اپنی مصری قوم کے ساتھ اُس کا جو معاملہ تھا اس کی پوری تصویر سورۂ زُخرُف کے صرف ایک فقرے میں کھینچ دی گئی ہے۔ "اُس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ" (الزخرف ۵۴)۔ اس میں فرعونی سیاست اور اس کی قوم کی گری ہوئی اخلاقی حالت، دونوں کا نقشہ

سامنے آجاتا ہے۔

"جب کوئی شخص کسی ملک میں اپنی مطلق العنانی چلانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے کھلم کھلا ہر طرح کی چالیں چلتا ہے، ہر فریب اور مکر و دغا سے کام لیتا ہے، کھلے بازار میں ضمیروں کی خرید و فروخت کا کاروبار چلاتا ہے، اور جو بکتے نہیں انہیں بے دریغ کچلتا اور روندتا ہے، تو خواہ وہ زبان سے یہ بات کہے یا نہ کہے، اپنے عمل سے صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اس ملک کے باشندوں کو عقل اور اخلاق اور مردانگی کے لحاظ سے ہلکا سمجھتا ہے اور اس نے ان کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ میں ان بیوقوف، بزدل، اور بے ضمیر لوگوں کو جدھر چاہوں ہانک کر لے جا سکتا ہوں۔ پھر جب اس کی یہ تدبیریں ملک میں کامیابی کے ساتھ چل جاتی ہیں اور باشندگانِ ملک اس کے دست بستہ غلام بن کر رہ جاتے ہیں تو وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ اس خبیث نے جو کچھ انہیں سمجھا تھا، واقعی وہ وہی کچھ ہیں، اور اُن کے اِس ذلیل حالت میں مبتلا ہونے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر "فاسق" ہوتے ہیں۔ اُن کو اس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ انصاف کیا ہے اور ظلم کیا۔ سچائی اور دیانت اور شرافت قدر کے لائق ہے یا جھوٹ اور بے ایمانی اور رذالت۔ ان مسائل کے بجائے ان کے لیے اصل اہمیت صرف اپنے ذاتی مفاد کی ہوتی ہے جس کے لیے وہ ہر ظالم کا ساتھ دینے، ہر جبار کے آگے دبنے، ہر باطل کو قبول کرنے اور ہر صدائے حق کو دبانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں"۔ (تفہیم القرآن جلد چہارم، الزخرف حاشیہ ۵۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ اس کے دربار میں اللہ جل شانہ کے پیغمبر کی حیثیت سے پہنچے اور انہوں نے ایسے صریح معجزے پے در پے پیش کیے جن کے متعلق ایک بیوقوف سے بے بیوقوف آدمی بھی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ یہ جادو کے کرشمے ہیں اُن کو وہ محض اپنی کبریائی کے زعم میں جادو ہی کہتا رہا اور اس کے درباری اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ عصا کے اژدھا بن جانے کو تو خود اُس کے بلائے ہوئے ماہر جادوگروں نے مان لیا کہ یہ ان کے فن کی چیز نہیں بلکہ خدا کا معجزہ ہے۔ رہے دوسرے معجزات، مثلاً حضرت موسیٰؑ کے پیشگی اعلان کے مطابق پوری سرزمین مصر میں قحط برپا ہونا اور ان کی دعا ہی سے اس کا دور ہونا، ان کے اعلان پر سارے ملک میں بارشوں کا ہولناک طوفان آنا اور ان کی دعا ہی سے اس کا ختم ہونا، اُن کے اعلان پر ٹڈی دل

کا خوفناک حملہ ہونا اور ان کی دعا سے اس کا دفع ہونا ، اِسی طرح ان کے اعلان کے مطابق جوؤں اور سُرسُریوں کا عذاب، مینڈکوں کا عذاب اور خون کا عذاب باری باری پورے ملک میں آنا اور صرف اُن کی دعا سے اُن کا ٹلنا، اِس شبہ کی ادنیٰ گنجائش بھی نہ چھوڑتا تھا کہ یہ کسی ساحر کی جادوگری ہے بلکہ ان مسلسل واقعات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ایسے کام نہ آج تک کوئی جادوگر کر سکا ہے اور نہ کر سکتا ہے، بلکہ یہ صریحاً اللہ رب العالمین کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عذاب کے آنے پر فرعون اور اس کے اہلِ دربار حضرت موسیٰؑ سے کہتے کہ آپ کو اپنے رب کے ہاں جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر دُعا کیجیے کہ یہ عذاب ہم پر سے ٹل جائے تو ہم آپ کی بات مان لیں گے، مگر جب وہ ٹل جاتا تو وہ اپنے عہد سے پھر جاتے تھے (الاعراف ۱۳۴-۱۳۵ ۔ الزخرف ۴۹-۵۰) ۔ قرآن میں صاف کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دلوں میں یقین رکھتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ حق پر ہیں اور پھر ظلم و سرکشی کی وجہ سے انکار کیے چلے جا رہے تھے (النمل ۱۴) ۔ یہ حقیقت اُس وقت بالکل کھل گئی جب فرعون اپنے لشکروں سمیت غرق ہونے لگا اور اُس نے پکار کر کہا کہ "میں مان گیا کہ کوئی خدا اُس کے سوا نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اسلام لانے والوں میں سے ہوں" (یونس - ۹۰) ۔

اس طرح حق کو حق جان لینے کے باوجود اُس نے اور اس کے درباریوں نے باطل پرستی اور ظلم و تکبر کی حد کر دی۔ "اُس کے درباریوں نے اس سے کہا کہ کیا حضور اِس موسیٰ اور اِس کی قوم کو اسی طرح چھوڑے رکھیں گے کہ یہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کی اور آپ کے معبودوں کی بندگی چھوڑ دیں؟ اس نے کہا، نہیں، ہم ابھی حکم دیتے ہیں کہ ان کے لڑکوں کو قتل کیا جائے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے" (الاعراف - ۱۲۷) ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے جو حکم جاری ہوا تھا وہ پھر سے تازہ کیا گیا اور نیا حکم یہ دیا گیا کہ جو جو لوگ موسیٰؑ کے ساتھ ایمان لانے والے ہوں ان کے لڑکوں کو قتل کیا جائے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے (المومن - ۲۵) ۔ اُس نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ "اگر میرے سوا تو نے کسی کو خدا مانا تو میں تجھے قید کر دوں گا" (الشعراء - ۲۹) ۔ اپنے بھرے دربار میں کہا کہ "اے سردارو، میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور خدا بھی ہے" (القصص ۳۸)۔ بڑے دھڑلے سے اعلان کیا کہ "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" (النازعات ۲۴) ۔ غایت خیرہ چشمی کے ساتھ اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ ذرا ایک اونچی عمارت تو بنا۔ میں اس پر چڑھ کر دیکھوں تو سہی کہ موسیٰ کا خدا کہاں ہے (القصص ۳۸ ۔ المومن ۳۶-۳۷) ۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ اس نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا فیصلہ کر ڈالا اور اپنے اہلِ دربار سے کہا "چھوڑو مجھے کہ میں اِس موسیٰ کو قتل کر دوں اور یہ اپنے رب کو پکار دیکھے" (المومن ۲۶) ۔

ایک کردار یہ ہے جو اِس قصّے میں فرعون اور اس کے اَعیانِ سلطنت اور اس کی قوم کا نظر آتا ہے۔ دوسرا ایک نہایت عبرت انگیز اور سبق آموز کردار ساحرانِ مصر کا ہے جو اپنے دین کی حمایت میں حضرت موسٰی کا مقابلہ کرنے کے لیے سارے ملک سے جمع ہو کر آئے تھے۔ جب وہ آتے ہیں تو فرعون سے کہتے ہیں کہ سرکار، اگر ہم جیت گئے تو کچھ انعام تو ملے گا نا ؟ وہ کہتا ہے، انعام ہی نہیں ملے گا بلکہ تم تو ہمارے مقرّبین میں شامل ہو جاؤ گے۔ مگر وہی جادوگر جب حضرت موسٰیؑ کے معجزے سے اپنے جادو کو مغلوب ہوتے دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہاں جادو نہیں بلکہ خدائی طاقت کام کر رہی ہے، تو سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم نے مان لیا ربّ العالمین کو، موسٰیؑ اور ہارونؑ کے رب کو۔ اب اُن کے اندر یکلخت اتنا بڑا انقلاب واقع ہو جاتا ہے کہ فرعون اُنھیں ہاتھ پاؤں کٹوانے اور سولی پر چڑھا دینے کی دھمکیاں دیتا ہے اور وہ اُس کی کسی دھمکی کی پروا نہیں کرتے، اس سے صاف کہتے ہیں کہ تجھے جو کچھ کرنا ہے کر ڈال، ہم تیری خاطر اُن کھلی صداقتوں سے جو ہم نے دیکھ لی ہیں، اور اپنے خالق سے منہ نہیں موڑ سکتے (الاعراف ۱۱۳ تا ۱۲۶- طٰہٰ ۷۰ تا ۷۳- الشعراء ۴۱ تا ۵۱)۔

ایک اور کردار فرعون کے درباریوں میں سے ایک درباری کا ہے۔ وہ دل میں ایمان لا چکا تھا اور اُسے چھپائے ہوئے تھا۔ مگر جب فرعون نے حضرت موسٰی کے قتل کا اِرادہ کیا تو وہ بھرے دربار میں بے خوف اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا" کیا تم لوگ ایک شخص کو صرف اِس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے"؟ اِس کے بعد اُس نے ایک طویل اور پُرزور وعظ کہا جسے سورۂ مومن میں آیت ۲۸ سے ۴۴ تک مسلسل نقل کیا گیا ہے۔ اُس وعظ میں اُس نے کھلم کھلا فرعون اور اس کی سلطنت کے اعیان وارکان اور اس کی قوم کو خدا کے عذاب سے ڈرایا، ان سب کو سیدھا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی، اور اِس بات کی کچھ پروا نہ کی کہ اِس حق گوئی کا کیا نتیجہ اس کو دیکھنا پڑے گا۔

سب سے زیادہ شاندار کردار اِس میں حضرت موسٰیؑ کا سامنے آتا ہے۔ وہ ایک ایسی قوم کے فرد تھے جو مصر میں ذلّت کی آخری حد کو پہنچا دی گئی تھی اور اتنی جان بھی نہ رکھتی تھی کہ اپنے بچوں کے قتل پر اُف تک کر سکے۔ خود حضرت موسٰی پر ایک مصری کے قتل کا الزام تھا جس میں اُن کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے اور وہ ملک چھوڑ کر کئی سال تک مَدیَن میں پناہ گزین رہے تھے۔ اِس حالت میں جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبی مقرر کر کے، اور بس ایک لاٹھی اور یدِبیضا کا معجزہ دے کر فرعون جیسے جبّار کی حکومت سے جا ٹکرانے کا حکم دیا تو وہ اللہ کی مدد کے بھروسے پر کسی لاؤ لشکر کے بغیر اُس کے دربار میں جا کھڑے ہوئے۔ اُس کی کسی دھمکی سے مرعوب نہ ہوئے۔ اس کے

کسی جبر و ظلم کے آگے نہ دبے۔ سالہا سال تک مسلسل سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ جب فرعون نے علانیہ اُن کے قتل کا ارادہ کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اُس کی دھمکی کو اس کے منہ پر مار دیا کہ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ "میں نے پناہ لے لی اپنے اور تمہارے رب کی ہر اُس متکبر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا" (المومن ۲۷)

دوسری تاریخی مثالیں

اسی طرح قرآن میں دوسری بہت سی تاریخی مثالیں پیش کر کے یہ اچھی طرح واضح کر دیا گیا کہ اسلام کس کردار اور اخلاق کے انسانوں کو پسند کرتا ہے اور کیسے انسان اس کو ناپسند ہیں۔ مثلاً ایک طرف حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام ہیں جو تختِ شاہی پر متمکن ہونے کے باوجود خدا ترسی و آئینِ بندگی سے ذرا نہیں ہٹتے، غرور و تکبر کے بجائے شکر اور اطاعت کے طریقے پر قائم رہتے ہیں، اور جہاں بھی انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اُن کو آزمائش میں ڈالا گیا ہے، فوراً عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جاتے ہیں (ص، ۱۷ تا ۲۴۔ النمل ۱۹۔ ۴۰۔ ص ۳۴۔ ۳۵)۔ ملکۂ سبا ہے جو ایک مشرک قوم کی فرمانروا ہونے کے باوجود جب حق سے آگاہ ہوجاتی ہے تو بلا تأمل اسے قبول کر لیتی ہے اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتی کہ اُس کی مشرک قوم اُس کا ساتھ دیتی ہے یا نہیں (النمل ۴۴)۔ سورۂ یٰسٓ کا ایک مردِ حق پرست ہے جس کی قوم تین پیغمبروں کی شدید مخالفت کرتی ہے اور انہیں سنگسار کر دینے پر آمادہ ہوجاتی ہے، مگر وہ اِس خطرناک حالت میں بھی شہر کے ایک حصے سے دوڑتا ہوا آتا ہے، قوم کو پیغمبروں کی بات مان لینے کی تلقین کرتا ہے، اُس کی گمراہی دلیل کے ساتھ ثابت کرتا ہے، اپنے ایمان کا صاف صاف اعلان کرتا ہے، اور اس کی پاداش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، پھر بھی اس کے دل سے ظالموں کے حق میں بددعا نہیں نکلتی، بلکہ وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اُس کی قوم کے لوگ اب بھی جان لیں کہ کس چیز کی بدولت اُس کے رب کے ہاں اُسے عزت اور مغفرت نصیب ہوئی (آیات ۱۳ تا ۲۷)۔ اصحابِ کہف ہیں جو ایک مشرک قوم کے ظلم سے اپنا ایمان بچا لینے کے لیے محض خدا کے بھروسے پر ایک غار میں جا چھپتے ہیں اور اِس بات کی کوئی فکر نہیں کرتے کہ اِس پناہ گاہ میں وہ کب تک بے سہارا رہ سکیں گے۔ انہیں فکر ہوتی ہے تو بس یہ کہ وہ ایمان کے راستے سے نہ ہٹنے پائیں (الکہف ۱۳ تا ۲۰)۔ دوسری طرف قارون ہے جو حضرت موسیٰ کی قوم کا ایک فرد تھا، مگر دنیا پرستی کی خاطر فرعون کے مقرب درباریوں میں شامل ہوگیا تھا۔ اُس نے حرام کی دولت کے انبار جمع کیے اور اُن پر خوب اِترایا۔ نیک لوگوں نے اُسے بھلائی کی تلقین کی تو اُس نے یہ کہہ کر ان کی بات رد کر دی کہ مجھے جو کچھ ملا ہے وہ میری قابلیت کا نتیجہ ہے۔ دنیا پر فریفتہ لوگ اُس کی شان و شوکت

دیکھ کر اسے بڑا نصیب والا سمجھتے اور تمنا کرتے کہ کاش ہمیں بھی یہ شان نصیب ہو۔ مگر جب اللہ نے اُسے اور اس کے محل اور اس کی دولت کو زمین میں دھنسا دیا تو وہ اُن لوگوں کے لیے عبرت بن گیا جو اُس کا سا مرتبہ پانے کی آرزو رکھتے تھے (القصص ۷۶ تا ۸۲)۔ قوم سبا ہے جس کے ملک کو اللہ نے جنت بنا رکھا تھا، مگر جب اس نے قدر کی ناشکری کا راستہ اختیار کیا تو اللہ نے ایک خوفناک سیلاب سے اس کو تباہ کر دیا، اس کے باغ جھاڑ جھنکاڑ بن گئے، اور وہ ایسی پراگندہ ہوئی کہ عرب میں اس کی پراگندگی ضربُ المَثَل بن کر رہ گئی (سبا ۱۵ تا ۱۹)۔ سب سے زیادہ نزبدتر مثال یہود کی پیش کی گئی جنھوں نے خدا کی نافرمانیاں کر کے تاریخ میں دو بار فسادِ عظیم برپا کیا اور اس کی سزا یہ بھگتی کہ ایک مرتبہ بابل و آشور کے سخت گیر حکمرانوں نے انہیں غارت کیا اور دوسری مرتبہ رومیوں نے انہیں فلسطین سے نکال کر دنیا بھر میں پراگندہ کر دیا (بنی اسرائیل ۴ تا ۷) اسی آخری پراگندگی کے بعد وہ عرب میں پہنچے تھے اور اُن کا ایک ایک اخلاقی عیب اہلِ عرب کے سامنے تھا جس کی نشان دہی کر کے قرآن نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ اِن صفات کے انسانوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر اپنی دنیوی اغراض و خواہشات کے لیے خود اپنے مذہب کی تعلیمات کے خلاف اِس بھروسے پر گناہ کرتے تھے کہ ہمیں تو معاف کر ہی دیا جائے گا۔ (الاعراف ۱۶۹)۔ وہ کہتے تھے کہ اُمیوں (یعنی غیر یہودیوں) کے مال مار کھانے اور اُن کے ساتھ بدمعاملگی کرنے سے ہم پر کوئی گناہ عائد نہیں ہوتا (آل عمران ۷۵)۔ اُن کے علماء اور درویش لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے تھے (التوبہ ۳۴)۔ سود خواری اُن میں عام تھی حالانکہ ان کے دین میں اس سے منع کیا گیا تھا (النساء ۱۶۱) انہوں نے جادو ٹونے اور سفلی عملیات کا شیطانی کاروبار پھیلا رکھا تھا اور اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جھوٹ منسوب کرتے تھے (البقرہ۔ ۱۰۲)۔ اُن کے اندر ہر طرح کی بُرائیاں پھیلی ہوئی تھیں مگر انہوں نے یہ طریقہ چھوڑ دیا تھا کہ ایک دوسرے کو بُرے کاموں سے روکیں، اسی لیے وہ اخلاقی پستیوں میں گرتے چلے جا رہے تھے (المائدہ ۷۹) اور یہ وہ عیب ہے جسے قرآن نے تمام قوموں کی بربادی کا ایک عام سبب بیان کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود میں پچھلی قوموں کے پے در پے مبتلائے عذاب ہونے کے واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ "کیوں نہ اُن قوموں میں جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم، جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا، ورنہ ظالم لوگ تو اُنہی مزوں میں پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں" (آیات ۱۱۶-۱۱۷)

وہ بُرائیاں جن کی قرآن میں مذمت کی گئی

یہ ایک اسلوب تھا جس سے قرآن نے تاریخی واقعات کے پیرایے میں اپنی اخلاقی تعلیمات کو بیان کیا۔ اس کے بعد دوسرا اسلوب یہ ہے کہ اُس نے براہِ راست اُن بُرے اوصاف اور اعمال اور اخلاق کی مذمت کی جو قریش، اور عرب اور عام انسانی معاشرے میں پائے جاتے تھے۔ یہ ایسی بُرائیاں تھیں جن کو اچھا کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ اِن کے مقابلے میں اس نے بتایا کہ وہ اچھے اوصاف، اخلاق اور اعمال کیا ہیں جن سے اسلام افراد اور معاشرے کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ایسی خوبیاں تھیں جنہیں فضائلِ اخلاق ماننے سے انکار کر دینا بھی کسی کے بس میں نہ تھا۔

اب ہم پہلے اُن بُرائیوں کو بیان کریں گے جن کی قرآن میں مذمت کی گئی اور لوگوں کو بتایا گیا کہ اسلام اِن سے انسانی زندگی کو پاک کرنا چاہتا ہے۔

—— "تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) بُرائیاں کرنے کا خوگر ہے، جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا" (الھمزہ۔ ۱ تا ۳)۔

—— "تم نے دیکھا اُس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اُکساتا (یعنی نہ خود اپنے نفس کو اِس پر آمادہ کرتا ہے نہ دوسروں کو اِس بات پر اُکساتا ہے کہ غریب و محتاج لوگوں کی بھوک مٹانے کے لیے کچھ کریں)۔ پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں لوگوں کو دینے سے گریز کرتے ہیں (الماعون)۔

—— "انسان کا حال یہ ہے کہ اُس کا رب جب اسے آزمائش میں ڈالتا ہے (اور آزمائش کی خاطر) اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اسے آزمائش میں ڈالتا ہے (اور اس بنا پر) اُس کا رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں (یعنی یہ معیارِ عزت و ذلت نہیں ہے) بلکہ تم لوگ یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اُکساتے، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو" (الفجر ۱۵ تا ۲۰)۔

—— "جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ تو اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں" (النساء۔ ۱۰)۔

—— "تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی فکر نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اِسی فکر میں) تم لبِ گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں (یہ کوئی بھلائی نہیں ہے) عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا" (التکاثر ۱ تا ۳)۔

—— "اور کسی ایسے شخص کے دباؤ میں نہ آؤ جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے، طعنے دیتا ہے،

چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفاکار ہے، اور اِن سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے۔ (اُس کا دباؤ قبول نہ کرو محض اِس لیے کہ) وہ بہت مال واولاد رکھتا ہے" (القلم ۱۰ تا ۱۴)۔

——"تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جو لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اُٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اُس دن جب کہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے" (المطففین ۱ تا ۶)

——"انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو" (الرحمٰن ۹)۔

——(قیامت کے روز اہلِ جنت) "مجرمین سے پوچھیں گے کہ کیا چیز تمہیں دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور (حق کے خلاف) باتیں بنانے والوں میں ہم بھی شامل ہو جاتے تھے اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے" (المدثر ۴۰ تا ۴۶)۔

——(قیامت کے روز دوزخی کو زنجیروں میں باندھ کر لے جانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا جائے گا) "یہ نہ خدائے بزرگ پر ایمان رکھتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے پر اُکساتا تھا، لہٰذا آج نہ یہاں اِس کا کوئی یارِ غمخوار ہے اور نہ اِس کے لیے زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا" (الحاقہ ۳۳ تا ۳۷)۔

——"وہ کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال اُڑا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا؟" (البلد ۶-۷)۔

ڈھیروں مال اُڑا دینے سے مطلب اپنی دولت مندی کی نمائش اور اپنے فخر اور بڑائی کے اظہار کے لیے خوب مال خرچ کرنا ہے اور آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فخر جتانے والا کیا سمجھتا ہے کہ کوئی یہ دیکھنے والا نہیں ہے کہ اس نے یہ دولت کس طرح حاصل کی اور کن کاموں میں کس نیت سے اس کو اُڑا دیا؟

——"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور اپنے اِس خرچ کے بعد کسی پر کوئی احسان نہ جتائیں نہ (اُس شخص کو جسے انہوں نے مال دیا ہے) کوئی دُکھ دیں، اُن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر چشم پوشی اُس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیت دی جائے" (البقرہ ۲۶۲-۲۶۳)۔

——"اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر اُس شخص کی طرح ضائع نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے" (البقرہ ۲۶۴)۔

——— "جو لوگ اُس مال میں بُخل کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے اُن کو دیا ہے وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے بہتر ہے۔ بلکہ یہ اُن کے لیے بہت بُرا ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کرتے ہیں وہی قیامت کے روز اُن کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا" (آل عمران ۱۸۰)۔ بخل صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنا مال نہ اپنی ذات پر خرچ کرے اور نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ بخل یہ بھی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اپنے عیش و آرام، اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں اور اپنی دولت مندی کی نمائش پر اُڑاتا رہے مگر کسی نیک کام پر خرچ کرنے کے لیے اس کا دل آمادہ نہ ہو۔

——— "اللہ ایسے لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور اور اپنی بڑائی پر فخر کرنے والے ہیں، جو بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کرنے کے لیے کہتے ہیں اور اللہ نے جو کچھ اپنے فضل سے اُنہیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں" (النساء ۳۶-۳۷)۔

——— "جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں" (التغابن ۱۶)۔

——— "لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر اور زمین پر اکڑ کر نہ چل۔ اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ۔ سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے" (لقمان ۱۸-۱۹)۔

——— "اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو" (النساء ۳۲)۔ یعنی کسی کو اپنے مقابلے میں کسی حیثیت سے بڑھا ہوا دیکھ کر بے چین ہو جانا ہی رشک و حسد اور رقابت کی اصل جڑ ہے، جس کے باعث آدمی دوسرے سے جلنے لگتا ہے، اپنی بھلائی کے لیے اُس کی بُرائی چاہتا ہے، اور جو فضل جائز طریقے سے اُسے نہیں ملتا اُسے حاصل کرنے کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے۔

——— "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، لوگوں سے کہو کہ میرے رب نے تو حرام کیے ہیں فحش کام خواہ کھلے ہوں یا چھپے، اور گناہ اور ناحق کی زیادتی، اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر وہ بات کہو جس کے (مِن جانب اللہ ہونے کا) تمہیں علم نہیں ہے" (الاعراف ۳۳)۔

——— "اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان اصلاح کے کاموں سے باز رہنا ہو" (البقرہ ۲۲۴)

——— "اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے کوئی معاہدہ کیا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر کفیل ٹھیرا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اُس عورت

کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت کے ساتھ سوت کاتا اور آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو اپنے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے میں رہے۔ حالانکہ اللہ تو اس (عہد و پیمان) کے ذریعے سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے" (النحل ۹۱-۹۲)۔

—— "اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں اور اُن رابطوں کو کاٹتے ہیں جنھیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے (آخرت میں) بُرا ٹھکانا ہے" (الرعد ۲۵)۔

—— "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اُسے بگاڑ دیتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں" (النمل ۳۴)۔

—— سورۂ الحجرات میں جن اخلاقی بُرائیوں کی مذمت کی گئی ہے وہ ہیں ایک دوسرے کا مذاق اُڑانا، ایک دوسرے پر طعن کرنا، لوگوں کے بُرے بُرے لقب رکھنا، بے جا بدگمانیاں کرنا، دوسروں کے حالات کا تجسس کرنا، اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی بُرائی کرنا (آیات ۱۱-۱۲)۔

—— "قطعاً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے جہالت و نادانی کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کیا" (الانعام ۱۴۰)۔

—— "جب اُن میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اِس بُری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا اسے مٹی میں دبا دے" (النحل ۵۸-۵۹)۔

—— قیامت کے روز جب خدا کے حضور لوگوں کی پیشی ہوگی تو "زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قصور میں ماری گئی؟" (التکویر ۸-۹)۔

—— "جو شخص خود کوئی جرم یا گناہ کرے اور اس کا الزام کسی بے گناہ پر منصوب دے اُس نے بڑے بہتان اور گناہ کا بار سمیٹ لیا" (النساء ۱۱۲)۔

—— "تم کسی خائن کے حمایتی بنو..... اللہ کسی خیانت کار اور معصیت پیشہ کو پسند نہیں کرتا" (النساء ۱۰۵-۱۰۷)۔

—— "خائن اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا پھر ہر شخص کو اُس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور لوگوں پر کوئی ظلم نہ ہوگا" (آلِ عمران ۱۶۱)۔

—— "جانتے بوجھتے ایک دوسرے کی امانتوں میں خیانت نہ کرو" (الانفال ۲۷)۔

——— "جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتری ہو، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔ اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی کے لیے دو اسی کے دینے والے درحقیقت مال بڑھاتے ہیں" (الروم ۳۹)۔

——— "آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، اِلّا یہ کہ لین دین ہو تمہارے درمیان آپس کی رضامندی سے۔ ایک دوسرے کو ہلاک نہ کرو..... تم میں سے جو ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے" (النساء ۲۹-۳۰)۔

——— "آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے اُن کو اِس غرض کے لیے پیش کرو کہ لوگوں کے مالوں کا کوئی حصہ جان بوجھ کر گناہ کے ساتھ کھا جاؤ" (البقرہ - ۱۸۸)۔ اِس کا مطلب یہ بھی ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ اور یہ بھی کہ عدالت میں یہ جانتے ہوئے کہ مال دراصل دوسرے شخص کا ہے محض اس بنا پر معاملہ نہ لے جاؤ کہ وہ شخص اپنی ملکیت کا ثبوت نہ دے سکے گا، یا تم کوئی ہیر پھیر کر کے مقدمہ جیت جاؤ گے۔

——— "گواہوں کو شہادت دینے سے انکار نہ کرنا چاہیے جب وہ گواہی کے لیے بلائے جائیں..... اور شہادت کو چھپاؤ نہیں۔ جو اُسے چھپائے اس کا دل گناہ گار ہے" (البقرہ ۲۸۲-۲۸۳)۔

——— "جھوٹی بات کہنے سے پرہیز کرو" (الحج ۳۰)۔ اِسی میں جھوٹی شہادت بھی آجاتی ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عُدِلَت شھادۃُ الزُّورِ بالاشراک باللہ، "جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر رکھی گئی ہے"۔

——— "جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اُس میں سے حصہ پائے گا اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا" (النساء - ۸۵)۔ یعنی اس کی بھلائی یا اس کی بُرائی میں وہ بھی حصہ دار ہوگا

——— "سورۂ نور میں آیت ۴ سے ۲۳ تک پاک دامن عورتوں پر جھوٹے بہتان گھڑنے، اُن کو سننے اور آگے پھیلانے اور معاشرے کے اندر فحش کی اشاعت کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے جس کی تفصیلات کو چھوڑ کر طولِ کلام سے بچنے کے لیے ہم صرف آیات کے حوالے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اور یہ معاملہ صرف عورتوں ہی کی حد تک خاص نہیں ہے، مردوں پر بہتان لگانا بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسا عورتوں پر بہتان لگانا۔

——— "بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو" (النساء - ۱۹)۔ "اگر عورتوں کو طلاق دو اور ان کی عدّت پوری ہونے کو آئے تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو، یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ ان کو ستانے

کے لیے نہ روک رکھو تاکہ ان پر زیادتی کرو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرے گا" (البقرہ - ۲۳۱)۔

—— "عورتوں سے ان کے سرپرستوں کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو اور ان کے مہر معروف طریقے سے ادا کرو کہ وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں، آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں" (النساء - ۲۵)۔

—— "عورتوں سے اِس بات کا عہد لو کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امرِ معروف میں (اے نبی) تمہاری نافرمانی نہ کریں گی" (الممتحنہ - ۱۲)۔ بہتان گھڑ کر لانے سے مراد دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی عورت دوسری عورتوں پر غیر مردوں سے آشنائی کا الزام لگائے اور اس کا چرچا کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ بچہ تو کسی کا جنے اور شوہر کو اس دھوکے میں رکھے کہ بچہ اُس کا ہے۔

—— "اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے تاکہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور زینت کا ذریعہ بنے...... اے بنی آدم تم کو شیطان فتنے میں نہ ڈالے جس طرح اس نے تمہارے والدین (آدم و حوّا علیہما السلام) کو جنت سے نکالا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اُتروا دیے تھے تاکہ اُن کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھول دے" (الاعراف ۲۶-۲۷)۔

—— "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اِن سے کہو کس نے حرام کردیا اللہ کی اُس زینت کو جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے اور کھانے پینے کی پاک چیزوں کو؟" (الاعراف ۳۲)۔ "رہبانیت کی بدعت (عیسائیوں نے) خود نکالی، ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا" (الحدید ۲۷)۔

—— "کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے تم نشہ آور چیز بھی بناتے ہو اور اچھا رزق بھی حاصل کرتے ہو" (النحل ۶۷)۔ یعنی اللہ نے جو اچھا رزق دیا تھا اسے تم ایک بُرے کام، نشہ پیدا کرنے والی چیز بنانے کے لیے استعمال کرتے ہو۔

یہ بُرے اخلاق و اوصاف اور اعمال جن کی قرآن میں مذمت کی گئی تھی، اِن کی بُرائی سے انکار کرنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا، نہ قریش اور اہل عرب میں سے کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی ہمت رکھتا تھا کہ اُس کا معاشرہ اِن بُرائیوں سے پاک ہے، اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ جن بُرائیوں سے قرآن روک رہا ہے اُن میں سے کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب میں پائی جاتی ہے۔ ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کے سوا جو لوگ بھی صاف اور بے تعصب ذہن رکھتے تھے ان کے لیے یہ ماننے کے سوا چارہ نہ تھا کہ اِن بُرائیوں سے واقعی افراد اور معاشرے کو پاک ہونا چاہیے اور وہ شخص کوئی قصور نہیں کر رہا ہے جو انسانی زندگی کو ان سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ (باقی)

دعوتِ اسلامی کی کامیابی کا راستہ

تربیت گاہِ جماعتِ اسلامی میں سوال و جواب کی ایک محفل

(۲)

فارغ کارکنوں کی اُلجھن

سوال :- "تحریکِ اسلامی کے فارغ کارکن بالعموم اس اُلجھن کو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے روزمرہ کے کام کا نتیجہ محسوس طور پر یا اعداد و شمار میں واضح طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات دن بھر میں ایک ہی ملاقات ہوتی ہے یا سفر کر کے دُور دیہات میں جانے کے بعد مجوزہ پروگرام نہیں بنتا یا آدمی نہیں ملتا۔ تحریک کے رفقاء توقع رکھتے ہیں کہ جب ایک کارکن فارغ کر دیا گیا ہے تو کام کا نتیجہ محسوس طور پر اعداد و شمار میں آنا چاہیے۔ اس اُلجھن کا علاج کیا ہے؟"

جواب :- اس اُلجھن کے دو پہلو ہیں اور دونوں پہلوؤں کا علاج ہونا چاہیے۔ ایک پہلو تو ہے اُس شخص کی اُلجھن کا جو فارغ کارکن ہے، اور ایک پہلو ہے اُن لوگوں کی اُلجھن کا جو اس کارکن کو تحریک کا کام کرنے کے لیے فارغ کرتے ہیں، اُس کی کفالت کے لیے مال فراہم کرتے ہیں، اور اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کام کر رہا ہے یا نہیں، اور اگر کر رہا ہے تو کس طرح کر رہا ہے۔

جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے سب سے پہلے ہر فارغ کارکن کو خود اپنا بے لاگ محاسبہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ جب میں اسلام کے کام کے لیے فارغ کیا گیا ہوں اور میری ضروریات کا بوجھ جماعت نے اپنے ذمّے لے لیا ہے تو کیا میں اس کا حق ادا کر رہا ہوں؟ یہ محاسبہ اُسے عند اللہ اپنی جواب دہی کا احساس کرتے ہوئے کرنا چاہیے۔ اگر اس کا اپنا ضمیر یہ محسوس کرے کہ ادائے حق میں وہ کوتاہی کر رہا ہے تو اسے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے، خواہ جماعت اس کا محاسبہ کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ کوئی اور جانے یا نہ جانے، وہ خدا

تو اُس کی کوتاہی کو جانتا ہے جو عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ جماعت کو وہ بڑے معقول دلائل دے کر مطمئن کر سکتا ہے، مگر خدا کو تو کسی طرح دھوکا نہیں دے سکتا۔ اُسے اِس سارے معاملہ پر اِس لحاظ سے سوچنا چاہیے کہ اُس وقت وہ کیا جواب دے گا جب اس سے پوچھا جائے گا کہ اللہ کے بندے، تیرے لیے ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کا انتظام بھی کر دیا گیا اور ہمارے کام کے لیے تجھے فکرِ معاش سے بھی فارغ کر دیا گیا، پھر بھی تو نے اس کام میں جان نہ لڑائی! اس طرح اپنا محاسبہ کر کے ہر فارغ کارکن اپنی اُلجھن کو خود دُور کر سکتا ہے۔

رہی اُن لوگوں کی اُلجھن جو اسے فارغ کرتے ہیں، تو اُن کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کوئی معمار کا کام تو ہے نہیں کہ روز آپ آکر گِن لیں کہ آج کتنی اینٹیں رکھی گئیں۔ اِس حساب سے اگر آپ نے دیکھنا شروع کیا تو ظاہر بات ہے کہ کوئی فارغ کارکن بھی، امیر جماعت سمیت، اِس قابل نہیں رہے گا کہ اپنے کام سے آپ کو مطمئن کر سکے۔ آپ کو صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ فارغ کارکن اپنا وقت اور اپنی محنت فرض شناسی اور دل کی لگن کے ساتھ اُسی کام میں صَرف کر رہا ہے یا نہیں جس کے لیے اُسے فارغ کیا گیا ہے؟ وہ فضول کاموں میں تو اپنا وقت ضائع نہیں کر رہا ہے؟ وہ جماعت سے معاوضہ لے کر اپنے ذاتی مقاصد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے میں تو لگا نہیں رہتا؟ ایسی کوئی شکایت اُس سے نہ ہو تو آپ اِس لحاظ سے اس کے کام کو نہ جانچیں کہ اس کی کوششوں سے نتائج کس قدر برآمد ہوئے ہیں۔ یہ کام تو ایسا ہے کہ بسا اوقات ہفتوں اور مہینوں ہی نہیں، برسوں ایک شخص اپنی جان کھپاتا رہتا ہے اور پھر بھی ایسے نتائج برآمد نہیں ہوتے جنھیں ناپ کر اور تول کر دیکھا جا سکے۔ دعوت ہزارہا آدمیوں تک پہنچائی جاتی ہے مگر صرف چند آدمی اسے قبول کرتے ہیں، اور اُن کے بارے میں بھی یہ ضمانت کسی کے پاس نہیں ہوتی کہ وہ کتنے مخلص ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے انبیاء کو بھی ان کی مساعی کے نتائج اور ماحصل کے لحاظ سے نہیں جانچا ہے، بلکہ صرف اس لحاظ سے جانچا ہے کہ انھوں نے اپنا فرض کما حقہٗ ادا کر دیا ہے یا نہیں۔ نتائج کے لحاظ سے جانچا جاتا تو معاذ اللہ وہ انبیاء تک ناکام قرار پاتے جن کی کوششوں سے کوئی ایک شخص بھی ایمان نہ لایا۔ حضرت لوطؑ ہی کی مثال دیکھ لیجیے جن کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ "ہم نے وہاں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا"۔ اور یہ گھر خود حضرت لوطؑ کا تھا جس میں اُن کی بیوی تک عذاب کی مستحق پائی گئی۔

جماعت پر جمود کیوں طاری ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟

سوال: "ایک طرف تحریکِ اسلامی پورے عالم میں تیزی کے ساتھ متعارف ہو رہی ہے حتیٰ کہ کمیونسٹ

ممالک میں بھی اس کی گونج سنائی دے رہی ہے، دوسری طرف پاکستان میں یہ بات بہت بُری طرح کھٹکتی ہے کہ یہاں جماعت کے لوگوں اور خصوصاً ارکان کے اندر جمود کی کیفیت طاری ہے اور اکثر حضرات کی کیفیت بالکل ویسی ہو چکی ہے جیسی نسلی مسلمان کی ہے۔ یہ بات تحریک کے مستقبل کے بارے میں کسی لحاظ سے حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اس رُجحان کو بروقت روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو خدانخواستہ آج تک کی تمام کوششوں پر پانی پھر جانے کا خطرہ ہے۔ آپ کے نزدیک اس کیفیت کے طاری ہونے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں اور اس کے مداوا کے لیے کونسی تدبیر مؤثر ہو سکتی ہے ؟"

جواب: - اس سوال میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں جو باہم مُتناقِض ہیں۔ ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ تحریکِ اسلامی پورے عالم میں تیزی کے ساتھ متعارف ہو رہی ہے، اور دوسری بات یہ کہ پاکستان میں جماعت پر جمود طاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہاں جمود طاری ہے تو سارے عالم میں تحریک اسلامی تیزی کے ساتھ کیسے پھیل رہی ہے اور کون پھیلا رہا ہے۔ میں آغاز ہی میں اِس تناقُض کی طرف اس لیے توجہ نہیں دلا رہا ہوں کہ آپ کو کسی غلط قسم کی خود اعتمادی میں مبتلا کروں، بلکہ میرا مدعا آپ لوگوں کو صرف یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے کام کا جائزہ لیتے وقت نہ مثبت پہلو میں مبالغہ سے کام لینا چاہیے اور نہ منفی پہلو میں۔ بسا اوقات آدمی خود جامد ہوتا ہے اور اپنا جمود اسے ساری جماعت میں نظر آنے لگتا ہے۔ بسا اوقات آدمی بہت زیادہ پُرجوش ہوتا ہے اور جماعت کو جب وہ اپنی توقعات اور تمناؤں کے مطابق تیز رفتار نہیں پاتا تو کہتا ہے کہ اس پر جمود طاری ہے۔ بسا اوقات ایک شخص اپنے ذہن میں کام کا کوئی خاص نقشہ یا تصوّر رکھتا ہے اور جب جماعت اُس نقشے یا تصور پر کام کرتی نظر نہیں آتی تو وہ خیال کرتا ہے کہ جماعت کوئی کام نہیں کر رہی ہے۔

اس طرح کے مبالغوں سے بچتے ہوئے جماعت کے ہر فرد کو بھی اور پوری جماعت کو بھی بے لاگ جائزہ لینا چاہیے کہ کیا فی الواقع وہ جمود میں مبتلا ہے ؟ اور اگر ہے تو اس کا سبب کیا ہے ؟ اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کے لوگ اُس عہد ہی کو فراموش کر گئے ہوں جو جماعت میں داخل ہوتے وقت انہوں نے اپنے خدا سے کیا تھا۔ یہ سبب اگر خدانخواستہ واقعی موجود ہے تو ہم سب کو اور ہم میں سے ہر ایک کو سوچنا چاہیے کہ اپنے رب کے ساتھ یہ عہد ہم نے کسی مجبوری سے کیا تھا یا برضا و رغبت ؟ بے سوچے سمجھے کیا تھا یا خوب سوچ سمجھ کر پورے شعور کے ساتھ ؟ کسی دُنیوی غرض کے لیے کیا تھا یا اپنے ایمان کا تقاضا سمجھ کر خالص

اللہ کی رضا کے لیے ؟ میں نہیں سمجھتا کہ ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا ہوگا جس نے برضا و رغبت، پورے شعور کے ساتھ اور محض اللہ کی رضا کے لیے اپنے ایمان کا تقاضا سمجھ کر یہ عہد نہ کیا ہو۔ پھر جب واقعہ یہی ہے تو اِس راہ میں جمود کیسا ؟ کیا ہمارے ایمان کے تقاضے اب بدل گئے ہیں؟ کیا اللہ کی رضا ہمیں اب مطلوب نہیں رہی؟ یا ہماری رائے اب یہ نہیں رہی کہ اللہ کی زمین پر اس کے دین کو قائم کرنا ہمارا مقصد ہے؟ اِن سوالات کو اپنے ذہن میں رکھ کر ہم میں سے ہر شخص اگر روزانہ ایک مرتبہ بھی اپنے نفس کا جائزہ لیتا رہے تو جمود تو درکنار اس کا تصوّر اور اس کا اندیشہ تک باقی نہ رہے گا۔

جمود کا دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کو درست رکھنے کے لیے ابتدا سے محاسبہ و تنقید اور اصلاح و تطہیر کا جو طریقہ رکھا گیا تھا اُس پر عمل کرنا چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس طریقے کو مقرر کرنے کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جماعت میں جہاں بھی کوئی خرابی پیدا ہو رہی ہو اس کا بروقت نوٹس لیا جائے اور اسے رفع کیے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ جو شخص بھی سست پڑ رہا ہو یا غلط روش پر چل پڑا ہو، بلا تاخیر اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے، اور اصلاح نہ ہو سکے تو اسے رخصت کر دیا جائے۔ اگر یہ کام برابر ہوتا رہے تو جماعت میں ہمیشہ تطہیر کا عمل جاری رہے گا اور اس کے اندر غلط قسم کے آدمی نہ رہنے پائیں گے۔ غلط قسم کے آدمیوں کا جماعت میں موجود ہونا بہر صورت نقصان دہ ہے۔ وہ اگر فعّال نہ بھی ہوں تو ان کی چھوت رفتہ رفتہ دوسروں کو لگتی چلی جاتی ہے۔ اور اگر غلط ہونے کے ساتھ فعّال بھی ہوں تو ان کی ساری سرگرمیاں اِس کام میں صَرف ہوتی ہیں کہ جس بیماری میں خود مبتلا ہیں اسے ساری جماعت میں پھیلا دیں۔ اِس طرح کے آدمی جہاں بھی موجود ہوں فوراً اُن کا محاسبہ کیجیے۔ پھر یا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گے، یا انہیں جماعت سے نکلنا پڑے گا۔ جماعت کو صحتمند رکھنے کے لیے یہ عمل جاری رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس میں آپ تساہل سے کام لیں گے تو آئے دن آپ کو پریشان کُن مسائل سے سابقہ پیش آتا رہے گا۔

مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کیوں عذابِ الٰہی میں مبتلا ہوئی ؟

سوال: "قانونِ قدرت ہے کہ اصلاح کا کام کرنے والوں کو عذاب سے بچا لیا جاتا ہے مگر مشرقی پاکستان میں جماعتِ اسلامی کا سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا ہے" ؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ اقامتِ دین کے لیے کام کرنے والے کبھی زخمی نہیں ہوں گے کبھی شہید نہیں ہوں گے اور کبھی اُنہیں کسی قسم کی زک نہ اُٹھانی پڑے گی۔ اگر ایسا وعدہ اللہ تعالیٰ کر چکا ہوتا تو اس کے دین کا کام کرنے کے لیے لاکھوں کروڑوں آدمی بڑے اطمینان کے ساتھ کھڑے ہو جاتے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ

لیجیے کہ حق و باطل کی کشمکش میں اگر اہلِ حق کو جان و مال کا نقصان اُٹھانا پڑے، یا وہ شکست کھا جائیں اور اہلِ باطل کو غلبہ نصیب ہو جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہلِ حق پر عذابِ الٰہی نازل ہوا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے جو لوگ مشرقی پاکستان میں تھے انہوں نے جب دیکھا کہ ان کا ملک صریحاً کفر کی گود میں جا رہا ہے تو انہوں نے اُسے روکنے کے لیے اپنی جانیں لڑا دیں، ہزاروں شہید ہوئے، ہزاروں زخمی ہوئے، کثیر تعداد گرفتار ہوئی جسے سخت اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، اور مالی مصائب سے تو کوئی بھی نہ بچا۔ اِس کے باوجود وہ کفر کے غلبے کو نہ روک سکے۔ یہ اُن کے حق میں ہرگز عذابِ الٰہی نہیں ہے، بلکہ اُن کا اجر خدا کے ہاں ثابت ہے۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اُن کا عمل خدا کے ہاں ضائع نہیں ہوا، بلکہ اپنی محنتوں اور قربانیوں سے انہوں نے جو بیج بوئے ہیں وہ دنیا میں بھی ضائع نہیں ہوئے۔ وہ پھل لا رہے ہیں اور آگے جانے والوں کے پیچھے جو لوگ بچے رہ گئے ہیں وہ خدا کے فضل سے اس فصل کو کاٹنے اور مزید فصل بونے میں لگے ہوئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر کچھ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ وہاں لوگوں کی آنکھیں کھلنی شروع ہو گئیں اور بڑے بڑے پُرجوش بنگلہ دیشیوں کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب وہ جماعت کے لوگوں سے مل کر صاف صاف یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ ہم دھوکا کھا گئے، اور صحیح بات وہی تھی جو آپ کہہ رہے تھے۔ "جماعتِ اسلامی" اگرچہ وہاں باقی نہیں رہی ہے، کیونکہ ایک سرکاری جماعت کے سوا دوسری سب جماعتیں خلاف قانون ہو چکی ہیں۔ لیکن جماعت کے لوگ موجود ہیں، اور وہ برابر اپنا فرض انجام دیے جا رہے ہیں۔ آج وہاں کے لوگوں کا رجوع اُن کی طرف پہلے سے زیادہ ہے کیونکہ تجربے نے اُن کو کھوٹے اور کھرے کا فرق اچھی طرح بتا دیا ہے۔

میں مشرقی پاکستان کے بارے میں یہ باتیں صرف آپ کے اطمینان کے لیے بیان نہیں کر رہا ہوں، بلکہ اس سے بڑھ کر میرا مقصد عذابِ الٰہی کے اُس غلط تصور کو آپ کے ذہن سے مٹانا ہے جو اس سوال میں پایا جاتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کبھی ایسا وقت آ جائے کہ کفر کے ہجوم کا خطرہ پاکستان کے اِس حصّے کو بھی لاحق ہو جائے تو آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ اصلاح کا کام کرنے والے تو عذابِ الٰہی سے بچا ہی لیے جاتے ہیں، پھر جہاد کی کیا ضرورت؟ اور یہ غلط فہمی بھی آپ کو لاحق نہ ہو کہ اس سرزمین کو کفر کی گود میں جانے سے بچانے کے لیے اگر جماعتِ اسلامی کو اپنے مشرقی پاکستانی رفقاء کی طرح قربانیاں دینی پڑیں تو یہ گویا خدا کے عذاب میں مبتلا ہونا ہوگا۔ یہ دونوں باتیں سراسر غلط ہیں۔ اسلام کے گھر کو بچانے کے لیے ہمیں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینا ہوگا، اور یہ یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہوگا جس میں جان دینا شہادت ہے نہ کہ عذاب۔ اور ہمیں خدا کے فضل سے

پورا اطمینان ہے کہ اگر اس راہ میں پوری جماعت بھی کٹ مرے تو خدا پرستی کے جو بیج یہاں بوئے گئے ہیں وہ ہرگز ضائع نہ ہوں گے۔

جماعت کے لیے پختہ مرکز کیوں؟

سوال:- "موجودہ حالات میں جماعت نے مرکز کی تعمیر میں بے تحاشا رقم خرچ کر کے اور پکی عمارات بنا کر دشمنوں کے طعنوں کا راستہ کھول دیا ہے۔ اگر یہی رقم دعوت و تحریک کے کام پر خرچ کرتے تو زیادہ بہتر تھا۔"

جواب:- اس معاملے میں دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیجیے۔ ایک صورت یہ ہے کہ آپ مرکز بنائیں اور کچا پکا بنا کر بیٹھ جائیں۔ اس صورت میں دو تین سال وہ چلے گا پھر بار بار اُس کی مرمت کی ضرورت پیش آئے گی، اور ان مرمتوں کے اخراجات مستقل طور پر آپ کے بجٹ کا حصہ بنے رہیں گے۔ کبھی بارش کا طوفان آ گیا اور آسمان کے سامنے آپ کی چھتیں بھی برسنے لگیں تو آپ کا کتب خانہ، آپ کے دفاتر کے کاغذات، اور آپ کے دوسرے سامان الگ برباد ہوں گے، اور مرمتوں کے غیر معمولی اخراجات آپ پر الگ آ پڑیں گے۔ البتہ اس کا یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ آپ اپنی غربت اور بیکسی کا نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں نے اس وقت تعمیر کے لیے جو مدد دے دی ہے اس سے فائدہ اُٹھا کر پختہ عمارتیں بنا لیجیے تاکہ ستر اسّی سال پھر تعمیرات کی ضرورت پیش نہ آئے اور مرمت کے مصارف بھی بہت کم ہوں۔ ہمارے نزدیک یہ دوسری بات زیادہ بہتر ہے۔ عمارتیں جو بنائی جا رہی ہیں وہ پختہ تو ضرور ہیں مگر ان شاءاللہ بالکل سادہ ہوں گی۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہ ہو گی جسے آرائش و زیبائش اور شان و شوکت کے بے جا اظہار سے تعبیر کیا جا سکے۔

اقامتِ دین کے لیے جمہوری طریقوں ہی پر اصرار کیوں؟

سوال:- "موجودہ حالات میں، جب کہ جمہوریت کے نام پر تمام جمہوری اداروں کی مٹی پلید کر دی گئی ہے، ہر قسم کی آزادی سلب کر لی گئی ہے، بنیادی حقوق کچل کر رکھ دیے گئے ہیں، جماعتِ اسلامی محض جمہوری طریقوں سے اسلامی نظام کیسے قائم کر سکے گی؟ کیا اِس کے سوا اور کوئی طریقہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار نہیں کیا جا سکتا؟"

جواب:- جن حالات کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، اُن کو دیکھ کر فی الواقع بکثرت لوگ اس اُلجھن میں

پڑ گئے ہیں کہ آیا جمہوری طریقوں سے یہاں کوئی تبدیلی لائی جاسکتی ہے یا نہیں، اور ایک اچھی خاصی تعداد یہ سمجھنے لگی ہے کہ ایسے حالات میں غیر جمہوری طریقے اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ بجائے خود ہمارے حکمرانوں کی بہت بڑی نادانی ہے کہ انہوں نے لوگوں کو اس طرح سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن ہم اس پوری صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اور اس کی پیدا کردہ تمام صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بھی اپنی اس رائے پر قائم ہیں کہ اسلامی نظام، جسے برپا کرنے کے لیے ہم اٹھے ہیں، جمہوری طریقوں کے سوا کسی دوسری صورت سے برپا نہیں ہوسکتا، اور اگر کسی دوسرے طریقے سے برپا کیا بھی جاسکے تو وہ دیرپا نہیں ہوسکتا۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے آپ جمہوری طریقوں کا مطلب واضح طور پر جان لیں۔ غیر جمہوری طریقوں کے مقابلے میں جب جمہوری طریقوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نظامِ زندگی میں جو تبدیلی بھی لانا، اور ایک نظام کی جگہ جو نظام بھی قائم کرنا مطلوب ہو، اسے زور زبردستی سے لوگوں پر مسلط نہ کیا جائے، بلکہ عامۃ الناس کو سمجھا کر اور اچھی طرح مطمئن کرکے انہیں ہم خیال بنایا جائے اور ان کی تائید سے اپنا مطلوبہ نظام قائم کیا جائے۔ اس کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ عوام کو اپنا ہم خیال بنا لینے کے بعد غلط نظام کو صحیح نظام سے بدلنے کے لیے ہر حال میں صرف انتخابات ہی پر انحصار کرلیا جائے۔ انتخابات اگر ملک میں آزادانہ و منصفانہ ہوں اور ان کے ذریعے سے عام لوگوں کی رائے نظام کی تبدیلی کے لیے کافی ہو، تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں لیکن جہاں انتخابات کے راستے سے تبدیلی کا آنا غیر ممکن بنا دیا گیا ہو، وہاں جبّاروں کو ہٹانے کے لیے رائے عامہ کا دباؤ دوسرے طریقوں سے ڈالا جاسکتا ہے، اور ایسی حالت میں وہ طریقے پوری طرح کارگر بھی ہوسکتے ہیں جبکہ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بھاری اکثریت اس بات پر تُل جائے کہ جبّاروں کا من مانا نظام ہرگز نہ چلنے دیا جائے گا اور اس کی جگہ وہ نظام قائم کرکے چھوڑا جائے گا جس کے صحیح و برحق ہونے پر لوگ مطمئن ہوچکے ہیں۔ نظامِ مطلوب کی مقبولیت جب اس مرحلے تک پہنچ جائے تو اس کے بعد غیر مقبول نظام کو عوامی دباؤ سے بدلنا قطعاً غیر جمہوری نہیں ہے، بلکہ ایسی حالت میں اس نظام کا قائم رہنا سراسر غیر جمہوری ہے۔

اس تشریح کے بعد آپ کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ رہے گا کہ ہم اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے جمہوری طریقوں پر اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ کوئی دوسرا نظام مثلاً کمیونزم لوگوں پر زبردستی ٹھونسا جاسکتا ہے، بلکہ

اس کے قیام کا ذریعہ ہی جبر اور جباریت ہے، اور خود اس کے ائمہ علانیہ یہ کہتے ہیں کہ انقلاب بندوق کی گولی ہی سے آتا ہے۔ استعماری نظام اور سرمایہ داری نظام اور فسطائی نظام بھی رائے عام کی تائید کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ رائے عام کو طاقت سے کچل دینا اور اس کا گلا گھونٹ دینا ہی ان کے قیام کا ذریعہ ہے۔ لیکن اسلام اس قسم کا نظام نہیں ہے۔ وہ پہلے لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنا ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر لوگ خلوص کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چل سکتے۔ پھر وہ اپنے اصولوں کا فہم اور ان کے برحق ہونے پر اطمینان بھی عوام کے اندر ضروری حد تک، اور خواص (خصوصاً کارفرماؤں) میں کافی حد تک پیدا کرنا لازم سمجھتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر اس کے اصول و احکام کی صحیح تنفیذ ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ عوام و خواص کی ذہنیت، اندازِ فکر، اور سیرت و کردار میں بھی اپنے مزاج کے مطابق تبدیلی لانے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ نہ ہو تو اس کے پاکیزہ اور بلند پایہ اصول و احکام اپنی صحیح روح کے ساتھ نافذ نہیں ہو سکتے۔ یہ جتنی چیزیں میں نے بیان کی ہیں، اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لیے سب کی سب ضروری ہیں، اور ان میں سے کوئی چیز بھی جبراً لوگوں کے دل و دماغ میں نہیں ٹھونسی جا سکتی۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کے لیے ناگزیر ہے کہ تبلیغ، تلقین اور تفہیم کے ذرائع اختیار کر کے لوگوں کے عقائد و افکار بدلے جائیں، ان کے سوچنے کے انداز بدلے جائیں، ان کی اقدار (VALUES) بدلی جائیں، ان کے اخلاق بدلے جائیں، اور ان کو اس حد تک ابھار دیا جائے کہ وہ اپنے اوپر جاہلیت کے کسی نظام کا تسلط برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ جمہوری طریقوں کے سوا اس کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام کو عملاً برپا کر دینے کے لیے کوئی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں کو اس نوعیت کی عوامی تائید حاصل نہ ہو جائے۔

شاید آپ میری یہ باتیں سن کر سوچنے لگیں گے کہ اس لحاظ سے تو گویا ابھی ہم اپنی منزل کے قریب ہونا درکنار، اس کی راہ کے صرف ابتدائی مرحلوں میں ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اپنے آج تک کے کام کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ جمہوری طریقوں سے کام کرتے ہوئے آپ پچھلے ۴۳ سال میں تعلیم یافتہ طبقے کی بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہیں، اور یہ لوگ ہر شعبۂ زندگی میں موجود ہیں۔ نئی نسل، جو اب تعلیم پاکر اٹھ رہی ہے، اور جسے آگے چل کر ہر شعبۂ زندگی کو چلانا ہے،

وہ بھی جاہلیت کے علمبرداروں کی ساری کوششوں کے باوجود زیادہ تر آپ کی ہم خیال ہے۔ اب آپ کے سامنے ایک کام تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے ہم خیالوں کی تعداد اسی طرح بڑھاتے چلے جائیں، اور دوسرا کام یہ ہے کہ عوام کے اندر بھی نفوذ کر کے ان کو اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرنے کی کوشش کریں۔ پہلے کام کے لیے لٹریچر کا پھیلنا آج تک جتنا مفید ثابت ہوا ہے اس سے بدرجہا زیادہ آئندہ مفید ثابت ہو سکتا ہے، اگر آپ اپنے ہم خیال اہلِ علم کے حلقے منظم کر کے مختلف علوم کے ماہرین سے مسائلِ حیات پر تازہ ترین اور محققانہ لٹریچر تیار کرانے کا انتظام کریں۔ اور دوسرے کام کے لیے تبلیغ و تلقین کے دائرے وسیع کرنے کے ساتھ اصلاحِ خلق اور خدمتِ خلق کی ہر ممکن کوشش کیجیے۔ آپ صبر کے ساتھ لگاتار اس راہ میں جتنی محنت کرتے چلے جائیں گے اتنی ہی آپ کی منزل قریب آتی چلی جائے گی۔

رہا یہ سوال کہ جب تمام جمہوری اداروں کی مٹی پلید کر دی گئی ہے، شہری آزادیاں سلب کر لی گئی ہیں اور بنیادی حقوق کچل کر رکھ دیے گئے ہیں، تو جمہوری طریقوں سے کام کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا کام کرنے کے لیے کھلی ہموار شاہراہ تو کبھی نہیں ملی ہے۔ یہ کام تو جب بھی ہوا جبر و ظلم کے مقابلے میں ہر طرح کی کڑیاں جھیل کر ہی ہوا، اور وہ لوگ کبھی یہ کام نہ کر سکے جو یہ سوچتے رہے کہ جاہلیت کے علمبرداروں کی اجازت، یا اُن کی عطا کردہ سہولت ملے تو وہ راہِ خدا میں پیش قدمی کریں۔ آپ جن برگزیدہ ہستیوں کے نقشِ پا کی پیروی کر رہے ہیں، اُنھوں نے اُس ماحول میں یہ کام کیا تھا جہاں جنگل کا قانون نافذ تھا اور کسی شہری آزادی یا بنیادی حق کا تصور تک موجود نہ تھا۔ اس وقت ایک طرف دل موہ لینے والے پاکیزہ اخلاق، دماغوں کو مسخر کر لینے والے معقول دلائل، اور انسانی فطرت کو اپیل کرنے والے اُصول اپنا کام کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف جاہلیت کے پاس اُن کے جواب میں پتھر تھے، گالیاں تھیں، جھوٹے بہتان تھے اور کلمۂ حق کہتے ہی انسانوں کی شکل میں درندے خدا کے ہر بندے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ یہی چیز درحقیقت اسلام کی فتح اور جاہلیت کی شکست کا ذریعہ بنی۔ جب ایک معقول اور دل لگتی بات کو عمدہ اخلاق کے لوگ لے کر کھڑے ہوں، اور سخت سے سخت ظلم و ستم سہنے کے باوجود اپنی بات ہر حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے چلے جائیں، تو لازمی طور پر اس کے تین نتائج رونما ہوتے ہیں۔ ایک نتیجہ یہ کہ اس صورتِ حال میں بہت زیادہ باہمت اور اولوالعزم لوگ ہی اس دعوت کو علانیہ قبول کرتے ہیں اور وہ اس کے لیے ایسا قیمتی سرمایہ ثابت ہوتے ہیں جو کسی دوسری صورت میں بہم نہیں پہنچ

سکتا۔ دوسرا نتیجہ یہ کہ ظالموں کی پیدا کردہ اس خوفناک فضا میں بکثرت، بلکہ بے اندازہ لوگ اس دعوت کو دل میں مان لیتے ہیں مگر آگے بڑھ کر اس میں شامل نہیں ہوتے۔ مخالف طاقت آخر کار اس کا خود نقصان اُٹھاتی ہے۔ اُسے قطعی اور حتمی شکست ہونے تک کبھی یہ پتہ ہی نہیں چلنے پاتا کہ جس دعوت کو مٹا دینے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے اس کے حامی کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ اُس کی اپنی صفوں تک میں موجود ہوتے ہیں اور وہ اُن سے بے خبر رہتی ہے۔ تیسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخلاقی برتری اور دعوت کی معقولیت وصداقت اپنی فطری طاقت سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے دشمن اُس کے پیروؤں پر جتنا زیادہ ظلم کرتے ہیں اُتنے ہی وہ ہر شریف النفس اور نیک طبع انسان کی نظر سے گرتے جاتے ہیں، اُس کے پیرو جتنی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ ظلم برداشت کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی حق پرستی سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے، اُتنی ہی ان کی قدر ومنزلت عام دیکھنے والوں ہی میں نہیں، بلکہ خود دشمنوں کی صفوں میں بھی بڑھتی چلی جاتی ہے، اور پھر جب فیصلہ کن مقابلوں کا وقت آتا ہے تو قدم قدم پر اُن لوگوں کی ہمدردیاں طرح طرح سے کام آتی ہیں جو دشمنوں کے جبر کی وجہ سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے مگر دل سے اس دعوت کے حامی تھے، یہاں تک کہ آخر کار چند مٹھی بھر ہٹ دھرم دشمن ہی میدان میں رہ جاتے ہیں جن کا ساتھ دینے والا تو درکنار، ان کے پیچھے رونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ ظلم وجور کا ماحول جہاں بھی ہو اس کے مقابلے میں حق پرستی کا علم بلند کرنے اور بلند رکھنے سے یہ تینوں نتائج لازماً رُونما ہوں گے، اس لیے یہ تو حق کی کامیابی کا فطری راستہ ہے، آپ اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے جمہوری اداروں کی مٹی پلید ہونے اور شہری آزادیاں سلب ہو جانے اور بنیادی حقوق کچل دیے جانے کا رونا خواہ مخواہ روتے ہیں۔

اقبالؒ کا تصوّرِ قانون

سیّد ریاض الحسن صاحب ایڈووکیٹ سپریم کورٹ، لاہور

اقبال کے تصورِ قانون کے تین اجزاء ہیں:

۱۔ نہ صرف مسلمان بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کی سلامتی وبہبود اسی میں ہے کہ وہ اسلامی قانون کو اپنائیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ اسی لیے شیطان، جو انسان کا سب سے بڑا اور ازلی دشمن ہے اُس کی تمام تر کوشش یہ ہے کہ اسلامی قانون نافذ نہ ہوسکے۔ چنانچہ اقبال اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں کہتے ہیں:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اِس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
جانتا ہوں جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیّت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے
جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفرین
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقین

۲ - اسلامی قانون ایک ہمہ گیر وحدت ہے - اس میں ہرگز دوئی نہیں - سیاست اُس سے آزاد اور باہر نہیں، بلکہ وہ سیاست اور زندگی کے تمام دیگر شعبوں کو کما حقہٗ محیط ہے - اقبال اپنی کتاب "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOGHT IN ISLAM میں فرماتے ہیں۔

"اسلام میں ایک ہی حقیقت کو اگر ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مذہب بن کر دکھائی دیتی ہے۔ اور اسی کو اگر دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ مملکت اور سیاست ہو جاتی ہے۔ یعنی مذہب و سیاست اسلام میں ایک ہی حقیقت ہیں، حتیٰ کہ یہ کہنا بھی غیر صحیح ہے کہ مذہب اور مملکت ایک شے کے دو رُخ ہیں۔ اسلام ایک ناقابلِ تقسیم اور واحد حقیقت ہے۔ جس ادارہ کو ریاست کہا جاتا ہے وہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ توحید کے اِن ہی خصائص کو مادی پیکروں میں متشکل اور کارفرما کرنے کا ذریعہ ہے اور اس نصب العین کو انسانی معاشرہ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش ہے۔"

۳ - اسلامی قانون جس صورت اور جس حالت میں جناب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے وحی فرمایا مِنْ و عَن اُسی صورت اور حالت میں واجب العمل ہے - حالات و زمانہ کی مصلحت بینی و مصلحت کوشی سراسر الحاد ہے - اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے - اُس سے زیادہ اپنے بندوں کی مصلحتوں سے کوئی آگاہ نہیں ہوسکتا۔ اُس نے اپنے بندوں کی ہر عہد و محل کے لیے تمام مصلحتوں کو مدّنظر رکھ کر شریعت سازی کی ہے - اقبال رموزِ بیخودی میں فرماتے ہیں:

شارعِ آئیں شناسِ خوب و زشت
بہرِ تو ایں نسخۂ قدرت نوشت
عشرتِ باشی استوارت می کند
پختہ مثلِ کوہسارت می کند

اقبال اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آج کے دَور میں بجائے اس کے کہ شریعت کو کھینچ کر اور دُور از کار تاویلات کر کے اپنے ماحول کے مطابق کیا جائے ہمیں چاہیے کہ حالات اور اپنے ماحول کو شریعت کے سانچے میں ڈھالیں۔ اوّل الذکر قسم کے تجدّد زدہ افراد کے متعلق ضربِ کلیم میں فرماتے ہیں:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

شریعت عالمگیر بھی ہے اور ابدی بھی۔ شریعت کی ابدیت پر ضرب لگانے کے لیے جو لوگ جدید تقاضوں کا ذکر کرتے ہیں اور یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اب زمانہ بدل چکا ہے اور شریعت محمدی اس دور میں ناقابلِ عمل ہے، اقبال انہیں کم نظر کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

البتہ اقبال قوانینِ شریعت کی تشکیل جدید پر زور دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت کو ایسے الفاظ اور ایسے انداز میں پیش کیا جائے کہ اس کی ابدیت مغرب اور مغرب زدہ لوگوں پر واضح ہو جائے تاکہ وہ اس پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اس کے لیے وہ فرماتے ہیں:

"احکامِ شریعت کے تعین میں غلطیوں کے سدِ باب کا موثر طریقہ ایک ہی ہے اور وہ مسلمان ممالک میں فقہی تعلیم کے موجودہ طریق میں ایسی ہمہ گیر اصلاح ہے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے۔" (خطبات : ۱۷۶)

اقبال کے ارشاد کے مطابق اگر اسلامی قانون کو اہلِ مغرب کے سامنے ان کی قانونی زبان میں بیان کیا جائے تو اُن کے لیے اسلامی قانون کی فوقیت تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ میں اس وقت صرف اسلام کے بین الاقوامی قانون کی مثال پر اکتفا کروں گا:

یورپ میں بین الاقوامی قانون پر سب سے پہلی کتاب گروشیئس نے سترھویں صدی عیسوی میں لکھی۔ یہ ایک ابتدائی قسم کی کتاب ہے اور اس میں خود گروشیئس نے بین الاقوامی قانون کے میدان میں مسلمانوں کی عظمت کا اعتراف کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مسلمان قانون دانوں کا خوشہ چین ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں بین الاقوامی قانون یعنی سِیَر پر پہلی کتاب امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی نے آٹھویں صدی عیسوی میں لکھی۔ اس کا نام کتاب السِیَرَ الصغیر ہے۔ جب یہ کتاب شام کے امام اوزاعی کے پاس پہنچی تو انہوں نے فرمایا کہ عراق کے فقہاء کو اسلام کے بین الاقوامی قانون کا خاص علم نہیں ہے، یہ علم فقہائے شام کے پاس ہے، کیونکہ نبیٔ اکرمؐ کے مغازی کا زیادہ تر رُخ شام کی طرف رہا ہے۔ جب امام شیبانی نے یہ بات سنی تو انہوں نے

اس علم پر زیادہ تفصیل سے کتاب مرتب کی اور اس کا نام کتاب السِیَر الکبیر رکھا۔ جب امام اوزاعی نے یہ کتاب دیکھی تو اعتراف کیا کہ واقعی فقہائے عراق قانون کے دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبے میں بھی سبقت لے گئے ہیں۔ یہودی نژاد امریکی مستشرق مجید خدوری نے کتاب السیر الصغیر کا انگریزی میں ترجمہ ISLAMIC LAW OF NATIONS کے عنوان سے کیا ہے۔ اُس نے اپنا یہ ترجمہ جب امریکن سپریم کورٹ کے چیف جج PHILIP C. JESSEP کے پاس تقریظ کے لیے بھیجا تو اُس نے لکھا کہ "انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا دائرہ اختیار STATUTE OF INTERNATIONAL COURT OF JUSTICE کی دفعہ (1 X B) 38 کے تحت مندرجہ ذیل ہے:

THE COURT SHALL APPLY THE GENERAL PRINCIPLES OF LAW RECOGNISED BY CIVILISED NATIONS.

اس میں یہ بات کہیں نہیں ہے کہ صرف مغربی بین الاقوامی قانون کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ مسلمان بھی مہذب لوگ ہیں اور ان کے پاس بین الاقوامی قانون کا بیش قیمت سرمایہ موجود ہے۔ وہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے سامنے اصرار کر سکتے ہیں کہ اُن کے فیصلے ان کے بین الاقوامی قانون کے مطابق کیے جائیں۔"

یہ صرف کتاب السِیَر الصغیر کے متعلق ہے۔ جہاں تک کتاب السِیَر الکبیر کا تعلق ہے اُس کی شرح گیارھویں صدی عیسوی میں شمس الائمہ سرخسی نے چار ضخیم جلدوں میں شرح السِیَر الکبیر کے نام سے لکھی۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ پیرس سے چھپوا دیا ہے۔ یہ کتاب OPPENHEIM کی کتاب سے بدرجہا زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بین الاقوامی قانون کے اسرار و غوامض بیان کرتی ہے۔ امام ابن قیم جوزیہ نے چودھویں صدی عیسوی میں صرف CONFLICT OF LAWS پر "احکام اہل الذمہ" دو جلدوں میں لکھی میرے پاس یہ کتاب موجود ہے۔ اس میں معاملات کی ایسی ایسی صورتوں پر مدلل اور مفصل بحث کی گئی ہے جو ابھی تک مغربی دنیا کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہیں۔

مطبوعات

تہافت الفلاسفہ	امام محمد بن محمد بن محمد بن احمد الغزالی

تلخیص و ترجمہ: مولانا محمد حنیف ندوی

شائع کردہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

صفحات: ۲۱۹ قیمت: ۱۲ روپیہ

امام غزالیؒ کی مشہور کتاب تہافت الفلاسفہ اور اس کے جواب میں ابن رشد کی تالیف تہافت التہافہ کو اسلامی عقاید و افکار میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ امام غزالیؒ چونکہ فلسفے کی خارزار وادیوں سے گزر کر تصوف کے میدان میں آئے تھے اس لیے انہوں نے جہاں اسلام کے نظام عقائد کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ریب و تشکیک کے کانٹے خود بخود دماغ سے نکل جاتے ہیں وہاں انہوں نے فلسفہ کی فطری خامیوں، اس کے تضادات اور اس کی ناکامیوں کی بھی بڑے حکیمانہ انداز میں نشاندہی کی ہے اور فلاسفہ کے اس بر خود غلط گروہ کے پندار و غرور کو بھی خاک میں ملا دیا ہے جو عقلیات کے نشہ میں چور تھے اور بزعم خود یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ خرد خام کی کاوشوں سے زندگی کے سارے مسائل بطریق احسن حل ہو سکتے ہیں۔

فلسفہ کے میدان میں امام غزالیؒ کا اصل کارنامہ یہ نہیں کہ انہوں نے یونانی حکماء اور ان کے بعض مسلمان خوشہ چینوں پر بھرپور تنقید کر کے ان کی فکری لغزشوں سے دنیا کو آشنا کیا ہے بلکہ ان کی عظمت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ دینی افکار و معتقدات کی صحت کو جانچنے کے پیمانے فلسفیانہ دلائل اور منطقی قیل و قال سے مختلف ہوتے ہیں اس لیے وہ لوگ دین کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دیتے جو فلسفے کی عینک سے دین کا مطالعہ کرتے ہیں یا دینی معتقدات کو فلسفیانہ افکار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امام غزالیؒ کا موقف یہ ہے کہ فکر و تعقل کے فلسفیانہ اسلوب میں اس درجہ تناقض و تضاد اور اس حد تک یک رخا پن پایا جاتا ہے کہ اس کے بل پر ان مابعد الطبیعیاتی حقائق کو قطعی ثابت نہیں کیا جا سکتا جنہیں مذہب کی اساس کہا جاتا ہے۔

"تہافت الفلاسفہ" کے فاضل مترجم نے نہ صرف امام غزالیؒ کے اس تنقیدی شاہکار کو بڑی صحت کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالا ہے بلکہ آغاز میں ایک ایسا فکر انگیز مقدمہ بھی شامل کیا ہے جو ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ یہ مقدمہ

امام غزالیؒ کے افکار کا خلاصہ نہیں بلکہ اس حکیم صوفی اور ابن رشد کے خیالات کا عالمانہ محاکمہ بھی ہے۔ اس مقدمہ میں مولانا نے علامہ طوسی اور خواجہ زادہ کے تاریخی اور بصیرت افروز محاکموں سے استفادہ کے علاوہ دور جدید کے فلسفیانہ افکار سے بھی پوری طرح فائدہ اٹھایا ہے اور اس طرح اسلامی فلسفہ کے طلبا اور محققین کے لیے انداز تحقیق کے نئے راستوں کی نشاندہی کی ہے۔

اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوتا اگر فلسفے کی اُردو اصطلاحات کے ساتھ انگریزی کی متبادل اصطلاحیں بھی درج کر دی جاتیں۔

کتاب کا معیار طباعت گوارا اور قیمت مناسب ہے۔

روح سعید | تالیف: ڈاکٹر محمد سعید رمضان

مترجم: جناب محمد حنیف ایم اے۔

شائع کردہ: مکتبہ چراغ اسلام، بیرون کھیالی دروازہ، گوجرانوالہ۔

صفحات، ۷۸ قیمت: -/۳ روپیہ

دنیائے اسلام میں مغربی تہذیب کی یلغار کو روکنے کے لیے جو سعید روحیں میدان عمل میں اتری ہیں اُن میں ایک مقدس روح علامہ بدیع الزمان سعید نورسی ہے۔ خدا کے اس پاکباز بندے نے اتاترک کے پھیلائے فتنوں کا بڑی بےجگری سے مقابلہ کیا اور اسلام کو غالب قوت بنانے کے لیے ایک زبردست تحریک شروع کی جسے نورسی تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ اسی تحریک کا اثر ہی ہے کہ ترکی کے اندر کمالی فتنے دب کر رہ گئے ہیں اور وہاں کا نوجوان اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔ اس مرد حق آگاہ کے حالات زندگی کو ڈاکٹر سعید رمضان نے بڑے اختصار کے ساتھ عربی میں قلمبند کیا ہے اور پاک و ہند کے معروف عالم دین مولانا محمد چراغ کے فرزند ارجمند نے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ترکی میں اسلام اور مغربی تہذیب کی کشمکش کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

(بقیہ اشارات) عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت کو نمایاں کیا جائے ۔ اُن کی سیرت کا نقش اُبھارنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ ان کے عہد کی صحیح عکاسی ہو چنانچہ اس کے لیے فلمسازوں نے پسِ منظر کے لیے رتھوں کو خاص اہمیت دی اور پھر اس عہد کے اندر جان پیدا کرنے کی غرض سے رتھوں کی دوڑ کا خاص طور پر التزام کیا گیا اور ڈرامے کی کہانی اس انداز سے آگے بڑھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پاکیزہ زندگی رتھوں کے پس منظر میں دب کر رہ گئی ۔

فلم کے شیدائیوں نے مہاتما بدھ کی سیرت کو اجاگر کرنے اور اُن کا پیغام پھیلانے کے لیے بھی ایک فلم تیار کی تھی لیکن جن لوگوں نے اس فلم کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھا ان کے اندر نیکی کے بارے میں احساس شکست ہی پیدا ہوا اور ان کے دلوں میں یہ بات گھر کر گئی کہ غلبہ ہمیشہ برائی کا ہوتا ہے اور نیکی کو اس کائنات میں مغلوب ہی رہنا ہے ۔ اس احساس کے پیدا ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ کہانی کو دلفگار المیہ بنا کر ہی اس کے اندر غیر معمولی اثر انگیزی پیدا کی جا سکتی تھی ۔ اگر برائی کی قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش نہ کیا جاتا اور اس کے مقابلے میں نیکی کی قوت بے لبسی، مظلومیت، یاس اور مجبوری کی تصویر کے طور پر سامنے نہ لائی جاتی تو عوام کے جذبات میں کبھی شدید تاثر پیدا نہ ہوتا ۔

دنیا کے معروف ناول نگار اور ڈرامہ نویسوں کی تخلیقات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اُن میں کسی شریف اور نیک نفس انسان کا کردار بالعموم دو حیثیتوں ہی سے سامنے آتا ہے ۔ یا تو شرافت کا پرچار کرنے والا بڑا عیّار اور مکّار ہوتا ہے جو نیکی اور شرافت کا لبادہ اوڑھ کر سادہ لوح عوام کی نیک نفسی سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے یا غبی اور کند ذہن ان ناولوں اور ڈراموں کا مطالعہ کرنے والے، اور اگر انہیں فلمایا گیا ہو تو ان فلموں سے لطف اندوز ہونے والے اس قسم کی تخلیقات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور کہانی لکھنے والوں کی قوت مشاہدہ اور جرأت کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں نے نیکی کے نام پر استحصال کرنے والوں کا پردہ چاک کیا ہے ۔ اس قسم کے ناولوں اور ڈراموں کے مطالعہ کا یہ اثر پڑتا ہے کہ ناپختہ اور خام ذہن اس نہج پر سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ خیر اور بھلائی کا ہر دعویدار لازمی طور پر بد باطن ہی ہے ۔

اسی نوعیت کی افسانہ نگاری کے برعکس جہاں نیکی اور شرافت کے مخلص علمبرداروں کے کردار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں اس بات کا خاص طور پر اہتمام ہوتا ہے کہ نیک نفسی اور شرافت مظلوم و مجبور

ہی نظر آئے کیونکہ یہ ڈرامے اور ناول کی فنی ضرورت ہے۔ اگر ڈرامہ نویس زندگی کی ان اعلیٰ اقدار کو اس حیثیت سے پیش نہیں کرتا تو ان کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں جذبۂ ترحم پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے اور اس طرح اپنی تخلیق کو فنی اعتبار سے مجروح کرتا ہے۔ اپنے کردار کو غم واندوہ کا پیکر بنانے کے لیے وہ یا تو اسے قدرت کی ستم کاریوں کا ہدف بناتا ہے جس سے فطرت ایک ظالم اور بے رحم قوت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے جیسے ہمیشہ بھلے آدمیوں پر ہی مشق ناز کرنے میں مزا آتا ہے یا وہ ماہر فن ادیب کسی خدا ترس انسان کے نیکی اور شرافت کے اصولوں اور ان سے اس کی مخلصانہ وابستگی کو اس انداز میں نمایاں کرتا ہے جس سے اس کا اخلاص اور اصول پرستی اس کے لیے وبال جان ثابت ہوتے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں پے درپے ناکامیوں کا سامنا کر کے اور مختلف قسم کے مصائب اور شدائد جھیل کر بڑی کس مپرسی کے عالم میں زندگی کی سرحد عبور کر جاتا ہے۔ یہ اندازِ بیان بھی اگرچہ بڑا اثر انگیز ہے لیکن اس المیہ میں قنوطیت پیدا کرنے اور اسے ڈرامائی رنگ دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ڈرامہ نویس اس شریف النفس انسان کی اس طریق سے کردار نگاری کرے جس سے یہ معلوم ہو کہ خود اس نے اپنے قول وفعل سے اپنی زندگی کو حزنیہ بنا لیا ہے۔ اس نوعیت کے جتنے ناول اور ڈرامے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر نظر آتی ہے کہ بھلے انسان میں فہم و تدبر کی کمی ہی اس کی زندگی کو المیہ بناتی ہے۔ آپ غور کریں کہ کیا اس نوعیت کے تاثرات قائم کر کے عوام کو دینِ حق کا علمبردار بنایا جا سکتا ہے؟

فلم کے بارے میں یہ بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ فلمسازی ایک ایسا دھندا ہے جو دولت اور شہرت کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس لیے جو لوگ بھی یہ کاروبار کرتے ہیں انہیں یہ فکر ہر لمحہ دامن گیر رہتی ہے کہ وہ عوام کے رجحانات اور میلانات کو سامنے رکھ کر فلمیں تیار کریں تاکہ وہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوں۔ چنانچہ دیکھیے کہ جس رفتار اور انداز سے عوام کا ذوق بگڑتا ہے اسی تناسب سے فلموں کے اندر فحاشی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہماری اخلاقی بربادی کے سارے اسباب کو اگر ایک پلڑے میں ڈال دیا جائے اور صرف فلم کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر ان کا وزن کیا جائے تو فلم کا پلڑا بلاشبہ دوسرے پلڑے سے زیادہ بھاری ہوگا۔ فلم نے انسانی معاشرے کو شیطانی چکر میں پھنسا دیا ہے۔ فلمساز بگڑے ہوئے افراد کے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے فلمیں تیار کرتے ہیں جن سے ان کے اخلاق کے اندر مزید بگاڑ پیدا ہوتا

ہے اور انہیں اس بات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ وہ پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ اخلاق سوز مناظر سے لطف اندوز ہوں۔ اُن کی اس ہوسناکی کو فلمساز ہی پورا کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور وہ ان کے لیے ایسی فلمیں تیار کرتے ہیں جو نہ صرف ان کے بگڑے ہوئے ذوق کی تسکین کا باعث ہوں بلکہ ان کے اخلاق اور زیادہ برباد کریں۔ اس قسم کے حالات میں فلم کے ذریعے حق وصداقت کے پرچار کا عزم اگر عیاری نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔

ہم ان معروضات کو انگریزی زبان وادب کے ایک معروف نقاد جانسن کی رائے پر ختم کرتے ہیں جو اگرچہ اُس نے ولیم شیکسپیر کے ڈراموں کے بارے میں دی ہے لیکن جس کا اطلاق قریب قریب ہر ڈرامے پر ہوتا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ڈراموں میں عشق ومحبت کی داستانوں کے متحرک کرداروں کے علاوہ ہمیں کوئی دوسری چیز کم ہی نظر آتی ہے۔ اس میں جو کردار بھی سامنے آتے ہیں وہ دام الفت کے اسیر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ عام انسانی زندگی کی صحیح تصویر ہے تو اس آسمان کے نیچے اس سے بڑی دروغ گوئی اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ محبت زندگی کے دوسرے داعیات کی طرح محض ایک داعیہ ہے جس میں زمانے کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق تغیر وتبدل رونما ہوتا رہتا ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی ہوشمند شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ انسانی زندگی کا واحد محرک جذبہ محبت ہی ہے اور باقی محرکات محض اضافی داعیات ہیں۔ لیکن اس حقیقت کے جانتے ہوئے بھی ڈرامہ نگار ڈرامے کے پلاٹ کا تانا بانا صرف محبت کے مصنوعی تاروں ہی سے تیار کرتا ہے اور تماشائیوں کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ کارگاہ حیات تو صرف عشق ومحبت کی وسیع جولانگاہ ہے۔ ڈرامہ نویس کے اس غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر اور حقیقت کو مسخ کرنے والی اس ذہنی کاوش کا محرک بجز اس کے اور کیا ہے کہ عام لوگ تفریح کے لمحات میں عشق ومحبت کی ہیجان انگیزی ہی سے حظ اُٹھانے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں اور ڈرامہ نویس انہیں یہ سہولت اور موقع فراہم کرتا ہے۔
